Course Title: B.Sc /B.Sc (FAD) (UG)

LANGUAGE URDU

State Education Policy (SEP) 2024-25 and on wards

Third Semester

Course Content: Khake , Qasida , Marsiya , Grammar and Interview

Course Credits	Total Contact Hours	Summative Assessment Marks =80
3	4/week	Farmative Assessment Marks = 20

UNIT : 1

خاکے

۱)	کندن	رشید احمد صدیقی
۲)	یادوں میں بسا آدمی (مخدوم محی الدین)	مجتبیٰ حسین
۳)	ام المومنین سیدہ خدیجہ الکبریٰ	ڈاکٹر محمد عبید الرحمان
۴)	م۔ن۔سعید	ڈاکٹر فوزیہ چودھری

UNIT : 2

قصیدہ اور مرثیہ

۱)	ہوا جب کفر ثابت، ہے وہ تمغائے مسلمانی	محمد رفیع سوداؔ
۲)	شہر آشوب	محمد رفیع سوداؔ
۳)	فرزند پیمبر کا مدینے سے سفر ہے	میر انیسؔ

UNIT : 3

گرامر

UNIT : 4

انٹرویو (مصاحبہ نگاری)

۲) اختر الایمان سے مکالمہ — محمود ایاز

۱) اردو ادیبوں سے ملاقات

رشید احمد صدیقی

کندن

کندن مر گیا اور گھنٹے بجتے رہے!

کندن کالج کا گھنٹہ بجاتا تھا، معلوم نہیں کب سے، کم وبیش ۳۰ - ۳۵ سال سے، اتنے دنوں سے اس پابندی سے کہ اس طرف خیال کا جانا بھی بند ہو گیا تھا کہ وہ مر جائیگا یا گھنٹہ بجانے سے باز آ جائیگا! طالب علمی کا زمانہ ختم کر کے اسٹاف میں آیا تو یہ گھنٹہ بجا رہا تھا، اسی کے گھنٹوں کے مطابق کام کرتے کرتے پوری مدت ملازمت ختم کی، یونی ورسٹی سے رخصت ہوا تو اسے گھنٹے بجاتے چھوڑا، گھنٹے کی آواز روزمرّہ کے اوقات میں اس طرح گھل مل گئی تھی جیسے وہ کہیں باہر سے نہیں میرے ہی اندر سے آ رہی ہو جیسے وہ وظائف جسمانی کے ان معمولات میں داخل ہو گئی ہو جن کا شعوری طور پر احساس نہیں ہوتا۔

کئی دن بعد کسی نے بتایا، کندن مر گیا۔ ایک دھچکا سا لگا، ارے کندن مر گیا۔ اتنے دنوں سے گھنٹے کی آواز آتی رہی اور حسب معمول یہی سمجھتا رہا کہ کندن بجا رہا ہے بتائے بغیر کیوں نہ معلوم ہو گیا کہ کندن مر گیا۔ نادانستگی میں اس کی یاد کے ساتھ یہ کیسا قصور ہوا! پھر وہی بات ذہن میں آئی جو ہمیشہ ہر ذہن میں آتی ہے کہ موت سے مخصوص افراد چاہے جس شدت سے متاثر ہوں، نظام فطرت میں اس سے زیادہ ناقابل التفات واقعہ دوسرا نہیں۔ اس سے فطرت کے نظام میں کوئی خلل پڑتا ہے نہ دنیا کے طور طریقوں میں فرق آتا ہے۔ اس احساس سے تسکین تو کیا ہوتی بے چارگی اور بے زاری کے احساس میں اضافہ ہو گیا۔ کیسے نہ کہوں کہ افراد کا متاثر نہ ہونا نظام فطرت کے متاثر ہونے نہ ہونے سے بڑا حادثہ ہے۔ انسان کی جس نہج پر ترکیب ہوئی ہے اس میں تو افراد ہی کے تاثرات سب کچھ ہیں۔ باقی ''تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سببی!''

کندن کے گھنٹہ بجانے پر مہدی منزل سے لے کر مشتاق منزل تک کی کلاسیں باہر آ جاتی۔ ترکی ٹوپی، سیاہ ترکش کوٹ اور پتلون نما سفید پاجاموں میں ملبوس ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے شریف، امیر، غریب گھرانوں کے خوبرو خوش اطوار ہنستے بولتے نوجوان اسی طرح برآمد ہوتے جیسے بقول انشاء ''ہوا کھانے کو نکلے ہیں جوانانِ چمن''۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک کتنے خاندانوں کی امیدوں اور امنگوں کا چمن کھلا ہوا نظر آتا۔ دو تین منٹ تک یہ ہمہمہ رہتا، پھر یہی لڑکے کلاس میں جا بیٹھتے۔ مقرر وقفے کے بعد کندن گھنٹہ بجاتا وہی سماں پھر نظروں کے سامنے آ جاتا۔ پڑھائی کے دنوں میں صبح سے سہ پہر تک یہی سلسلہ جاری رہتا۔ آتے جاتے پوچھ لیتا کندن کون کون سا گھنٹہ چل رہا ہے، اتنا گھنٹہ دریافت کرنے کے لیے نہیں جتنا اس سے ملنے کی تقریب منانے کے لیے۔ ہمیشہ جواب دیتا، ہجور فلان گھنٹہ۔ چاہے پوچھنے والا طالب علم ہو، معلم ہو یا کلرک۔ اس کے ہجور کہنے میں توقیر اور تواضع کی حلاوت تھی، خوشامد یا تصنع کی ملاوٹ نہیں۔

موت اور زیست کی گردش نے کتنوں کو بڑا کتنوں کو چھوٹا کتنوں کو یکساں کر دیا۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے، موت سے زیادہ ہم سطح کر دینے والی دوسری کوئی شے نہیں۔ اس ۳۰-۳۵ سال میں ہم سے قریب ہم سے دور ہمارے لائے ہوئے کیسے کیسے انقلابات برپا ہوئے۔ نوجوانوں کی کتنی نسلیں اس ادارے سے نکلیں اور زندگی کے چھوٹے بڑے محاربوں میں فتح و شکست سے کس کس طرح دوچار ہوئیں یا ہیں۔ ان سب کو کیسے اور کہاں تک یاد میں سمیٹوں۔ یہ سب ہوتا رہا لیکن کندن کا گھنٹہ بجانا جوں کا توں رہا۔ جیسے اس کا گھنٹہ بجانا یونیورسٹی کے موجود اور معتبر ہونے کا اعلان تھا۔ لیکن ہوا وہی جو بلآخر ہو کر رہتا ہے۔ کندن مر گیا۔ تقدیر کے اس معمول میں فرق نہ آیا۔ زز ندبچو توئی یار فسق ہپچومنی! اگر یہ ہے اور ہے بھی یہی تو یہ جنگ نامساوی طاقتوں کی ہے جس میں فتح ہمیشہ کمزور کی مانی جائیگی۔

یونیورسٹی کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ مرزا اختر حسین صاحب اسسٹنٹ رجسٹرار تھے جن کے سپرد امتحان کا کام تھا۔ کندن کو انھوں نے اپنا آنریری سکنڈ لفٹنٹ اور کوآڈرٹیگل (کچی پکی پارک) کے سارے مہتروں کا کمپنی کمانڈ مقرر کیا اور کھچیر (ایک بوڑھا مہتر) کو لانس کارپورل (Corporal Lance) خواص میں یہ کمپنی Fussiliery won Husain's Akhter Mirza (مرزا اختر حسین اون فوسیلری) کے لقب سے اور عوام میں کندن کی سفرمینا کے نام سے مشہور ہوئی۔ امتحان کے زمانے میں شروع سے آخر تک یونی ورسٹی میں مرزا صاحب کندن اور یہ سفرمینا پلٹن ایک دوسرے سے جدا یا دور نہیں دیکھی گئی۔

مرزا صاحب ہر کام ضابطے اور اہتمام سے کرنے کے شائق تھے۔ اس زمانے میں امیدوار کم ہوتے تھے۔ جن کے لیے اسٹریچی ہال کافی بڑا ہال تھا لیکن موصوف اس دھوم سے امتحانات منعقد کرتے جیسے نہ صرف امیدوار بلکہ ان کے والدین اور قریبی رشتہ دار سب کے سب شریک ہو جانے کا امکان تھا۔ اسٹریچی ہال کے سامنے سے اس زمانے میں گزرے تو اس کے اونچے برآمدے کے صدر دروازے پر مرزا صاحب کھڑے کمانڈ کرتے ہوتے۔ کوٹ کی اوپر کی جیب میں رنگ برنگ کی پنسلیں اس ترتیب سے نظر آتیں جیسے ملٹری منصب کا کوئی امتیازی ربن لگا ہوا ہے۔ کسی پنسل کو جگہ نہ ملی ہوتی تو لبوں میں دبا رکھتے۔ ہاتھ میں رنگین کھریا کے ایک آدھ ٹکڑے، بغل میں طرح طرح کی فائلیں۔ اور کاغذ کے پلندے ڈیسک یا کرسی پر یا فائلوں میں جہاں جس قسم کی ضرورت دیکھی کھریا سے نشان لگا دیے یا پنسل سے نوٹ لکھ دیے۔ زینے پر کندن اس سے نیچے سڑک پر مہتروں کی ''سفرمینا'' جاروب بدست و کھرپا در بغل، اٹینشن کھڑی ہوتی۔ کچھ اسی طرح کا نقشہ ہوتا جیسا آج کل قومی جھنڈے کو سلامی دینے کے لیے کوئی نیتا کھڑا ہوا اور دوسرے حسب مراتب نیچے صف آرا ہوں۔ مرزا صاحب کا حکم پاتے ہی کمپنی کمانڈر کندن، سفرمینا کے ایک حصے کو ساتھ لے کر اسٹریچی ہال میں نشستیں ترتیب دینے میں مصروف ہو جاتا، دوسرا ڈیٹیچ منٹ (Detachment) اہم پوزیشنوں پر جھاڑو دینے لگتا یا گھاس کھودنے لگتا۔

یہ زمانہ مالی مشکلات کا تھا، یونیورسٹی سے تنخواہ پانے والے معلموں کو پرچہ بنانے یا امتحان کی کاپیوں کے جانچنے کا معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ اس کی تلافی مرزا صاحب نے کچھ اس طور پر کی تھی کہ جو لوگ نگرانی کے کام پر مامور ہوں لمونیڈ اور برف ان کی خدمت میں مفت پیش کی جائے۔ اس کا حساب کندن رکھتا تھا اور مرزا صاحب ان اخراجات کی ادائیگی امتحان فنڈ سے کرتے تھے۔ ایک دن آفس پہنچا تو دیکھا کہ مرزا صاحب کندن پر گرج رہے ہیں۔ قصہ یہ تھا کہ ایک صاحب نے نگرانی کے دوران میں ڈیڑھ درجن بوتلیں اور اسی حساب سے برف

پی ڈالی تھی۔ مرزا صاحب کندن پر بگڑ رہے تھے کہ تو نے یہ صورت حال دیکھی تو مجھے کیوں نہ اطلاع دی، اس طرح تو امتحان فنڈ کا دیوالہ نکل جائیگا، مرزا صاحب کے حضور میں کندن کسی قدر شوخ تھا۔ کہنے لگا ہجور اطلاع کرتا تو پہلے۔۔۔ صاحب کے گھر والوں کو کرتا، آپ کو کرنے سے کیا پھائیدہ تھا! مرزا صاحب نے فوراً اس پرچہ پر بھی سرخ پنسل سے نشان لگا کر بل پاس کر دیا لیکن آئندہ کے لیے یہ رعایت ہمیشہ کے لیے اٹھالی! چوازقومے یکے بے دانشی کردو!

مرزا صاحب نے اندرونی ممتحنوں کے لیے ایک رعایت اور رکھی تھی۔ ہر سال امتحان کی پرانی کاپیوں سے سادے اوراق نکال کر نئی کاپیا بنائی جاتی تھیں۔ ہم میں سے جو لوگ مرزا صاحب کے صحیفۂ خوشنودی میں کوئی ممتاز مقام رکھتے تھے اور موصوف کو یقین دلا چکے ہوتے کہ ہم کو لکھنے پڑھنے کا کام دوسروں سے زیادہ کرنا پڑتا ہے، ان کا موصوف نے منصب یا وثیقہ مقرر کر دیا تھا۔ جیسے مغلوں کے ہاں پنج ہزاری یا سہ ہزاری منصب دار یا نوابان اودھ کے ہاں وثیقے دار ہوتے تھے۔ اسی طرح مرزا صاحب کے ہاں پنج سیری سے لے کر آدھ سیری تک کے منصب دار ہوتے تھے، یعنی ان کو ہر سال اتنے ہی سیر یا آدھ سیر امتحان کی کاپیوں سے نکالے ہوئے سادے اوراق دیے جاتے تھے۔ بعض اس کو مرزا صاحب کے جلوس شاہی کا یوم تقریب دوسرے اس کو فصل کی تیاری اور بٹائی کا زمانہ قرار دیتے تھے۔

یہ منصب داری یا وثیقہ یابی عظمت الٰہی زبیری کے عہد رجسٹراری تک برقرار رہی۔ اس کے بعد یہ قصہ ختم ہو گیا۔ کندن کے سپرد یہ کام تھا کہ یہ اوراق تول تول کر بنڈل باندھتا اور ہمارے گھروں پر پہنچا دیتا اور ہم سب کی توفیق کے مطابق انعام پاتا۔ کندن یہ بنڈل لے کر آتا تو میں پوچھ لیتا کیوں کندن مرزا صاحب کے حضوری ہماری کارگزاری میں کوئی فرق تو نہیں آیا۔ تول ٹھیک ہے؟ کہتا ہجور بالکل ٹھیک ہے، کھاتر جمع رکھیں۔ ایک دن کندن کی عملداری میں سے گزرا۔ نئی کاپیوں کے لیے پرانی کاپیاں پھاڑی جا رہی تھیں۔ پوچھا، کندن ہمارے وثیقے کا کیا ہوا، بولا، ہجور اب نبابی (نوابی) نہیں رہی۔ دوسرے عملداری ہے۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں تم تو اپنا وثیقہ وصول کرنے کے لیے نوابی زمانے والوں کے پاس آ ہی جایا کرو۔

کچھ دنوں بعد مرزا صاحب رجسٹرار ہو کر پٹنے چلے گئے اور امتحانات کے لیے، جہاں تک سیٹیں فراہم کرنے اور ان کو ترتیب دینے کا سوال تھا، کندن کو پورے اختیارات مل گئے۔ امتحانات سے آگے بڑھ کر سرکاری اور غیر سرکاری تقریبوں میں نشستوں کے انتظام کا فریضہ بھی رفتہ رفتہ کندن کے حصے میں آ گیا۔ اختیارات کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ کہیں سے کسی کو تفویض کئے جاتے ہیں، بعض لوگ جوڑ توڑ سے حاصل کرتے ہیں، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بزم مئے میں کوتاہ دستی کے قائل نہیں ہوتے بلکہ خود بڑھ کر ہاتھ میں اٹھا لیتے ہیں تو مینا انھیں کا ہو جاتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں ایسے اشخاص بھی ملتے ہیں جن کی طرف اختیارات خود کھنچے چلے جاتے ہیں جیسے پانی نشیب کی طرف مائل ہوتا ہے، ان ہی میں سے ایک کندن تھا۔ تقریب کہیں کیسی ہو، وقت کم ہو، مہمانوں کے بیٹھنے کا سامان فراہم کرنے میں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ حائل ہوں، گزشتہ ۳۰-۴۰ سال سے یہ مہم کندن اس خوبی سے انجام دیتا تھا کہ سب حیران رہ جاتے۔

مسلم یونیورسٹی میں یوں بھی طرح طرح کی جتنی چھوٹی بڑی صاف ستھری تقریبیں ''صلائے عام'' کے اصول پر منعقد ہوتی رہتی ہیں میرا خیال ہے ہندوستان میں شاید ہی کہیں اور اتنے سے مختصر رقبے اور آبادی میں جتنی کہ یونیورسٹی کی ہے، ہوتی ہوں۔ یہ اچھا ہے یا برا

اس بحث سے قطع نظر واقعہ وہی ہے جو بیان کیا گیا۔ ان تقریبوں سے خوبی کا خرابی کا غالباً وہ تقاضا یا توازن نیم شعوری طور پر پورا کرلیا جاتا ہے جو بڑے بڑے شہروں مثلاً دہلی، کلکتہ، بمبئی وغیرہ کا امتیاز یا آشوب سمجھا جاتا ہے۔ یونیورسٹی کے بڑے عہدہ داروں کی ایک اہم صفت اوران کی ثبات وصحت وحواس کا قوی ثبوت ایک یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک ہفتہ تک یونیورسٹی کے کھانے پینے کی ساری تقریبوں میں جہاں وہ بالضرور مدعو ہوتے ہیں، خورد ونوش کے ساتھ شرکت کی اور اپنے معالج سے سرخرو رہے۔

کسی شعبے یا شعبے کے کسی کمرے میں کتنے ڈسک اور کرسیاں ہیں، کیسی حالت میں ہیں، کتنی ٹوٹ پھوٹ میں آگئیں، ان کے بدلے میں کتنی اور آئیں اور اس کی خبر جتنی کندن کو تھی، خود شعبے کے چپراسی کو نہ تھی۔ امتحان کا کاروبار پہلے کی نسبت بہت بڑھ گیا ہے۔ فرنیچر کی کمی، وقت کی تنگی، کمروں کی کمی ان سب سے نپٹنے کے لیے کندن کی ''ایک شخصی وزارت'' کا مشورہ اور مدد لازمی تھی۔ کندن ہی بتا سکتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ کتنی نشستوں کا کہاں کہاں کس طرح انتظام ہوسکتا ہے۔ امتحان قریب ہوتا تو ہر شعبہ کے صدر کے نام رجسٹرار آفس سے ایک گشتی مراسلہ آجاتا کہ امتحان کے لیے زیادہ سے زیادہ جتنی کرسی اور ڈسک مہیا کیے جاسکیں، شکرگزاری کے موجب ہوں گے، یہ خط لے کر کندن جاتا۔ پوچھا۔ کندن کیسے کدھر آنکلے؟ ہجورامتحان ہے نہ، کرسی ڈسک چاہئیں۔ بھئی یہ ہمیشہ کا دھندا ہے۔ اس میں ایسا پوچھنا کیا۔ میاں خان (شعبے کا چپراسی) اور تم آپس میں سمجھ لو۔ کندن سامان اٹھوالے جاتا۔ امتحان کے ختم ہونے پر ہر کرسی اور ڈسک اسی کمرے میں اسی قرینے سے رکھی ہوئی مل جاتی جس طرح لے جائی گئی تھی۔

شعبہ کے فرنیچر پر نام اور نمبر کا اندراج بہت بعد کی چیز ہے، اس سے پہلے ان پر پہچان کا کوئی نشان نہ ہوتا۔ لیکن کندن کے پہچان اور اٹکل کو کیا کہیے کہ ہزاروں میز کرسیوں کو پہچانتا تھا کہ ان کا گھر کہاں ہے، کس خاندان کی ہیں، ان کو وہیں پہنچا دیتا۔ فرنیچر کے گھرانوں (شعبے جات جن کی امانت اور نگہداشت میں وہ فرنیچر تھے) میں کسی کو بھی اس کی شکایت نہیں ہوئی کہ کسی یاترا یا میلے میں اس کا کوئی عزیز غائب ہوگیا یا کسی کو اغوا کرلیا گیا۔

کنووکیشن (جلسہ تقسیم اسناد) کی تقریب عام طور سے ساڑھے گیارہ بجے سے شروع ہوکر ڈیڑھ پونے دو بجے ختم ہوتی ہے۔ اسی پنڈال میں تقریباً اتنے ہی اشخاص کے لیے عصر میں چائے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کنووکیشن کا جلسہ جس نوعیت کا ہوتا ہے جس طریقے سے جیسے گنجان نشستوں کا انتظام کیا جاتا ہے چائے کے لیے اس سے بالکل مختلف ترتیب لازم آتی ہے۔ جلسے میں چھوٹی میزوں کی ضرورت نہیں ہوتی، چائے کے لیے ہوتی ہے۔ پھر ہر میز کے گرد چار یا چھ مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے انتظام۔ تین گھنٹے کے اندر اندر اسی طرح کی صدہا میزوں کا لگانا اور سجانا اور صبح کی ترتیب کو یک لخت بدل دینا آسان کام نہیں ہے۔ دوپہر کے جلسے میں جو حضرات شریک ہوئے تھے، سہ پہر کو چائے پر آئے تو دیکھا کہ سارا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے، جیسے صبح کا جلسہ کہیں اور نہیں تو کسی اور دن ہوا تھا۔ اسی پنڈال میں رات کو مشاعرہ ہونے والا تھا۔ بیٹھنے کا انتظام پھر بدلا جائیگا۔ جیسے دیتے ہوں دھوکا یہ بازی گر کھلا۔ رات گئے تک یہ ''ہنگامہ شعروسخن'' پا رہیگا۔ دوسرے دن کندن اور کمپنی تمام میز کرسیاں حسب معمول اپنی اپنی جگہ پر پہنچا دیں گے۔

جلالتہ الملک شاہ سعود اور اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایران کے مختلف اوقات میں درود کی تقریبیں لوگوں کو یاد ہوں گی۔ چھ سات ہزار

نشستوں کا انتظام اس میدان میں کیا گیا تھا۔ جسمیں اب یونیورسٹی لائبریری کی نئی عالی شان عمارت کھڑی ہے، یہیں ان کو اعزازی ڈگریاں دی گئی تھیں۔ سہ پہر کی چائے کا انتظام ایک دفعہ کرکٹ، دوسری بار سوئمنگ باتھ لانس پر کیا گیا تھا، دونوں تقریبوں میں حسب معمول مشکل سے تین گھنٹے کا فصل تھا۔ پنڈال کا تقریباً تمام فرنیچر اتنے ہی عرصہ میں منتقل کر کے پلان کے مطابق ترتیب دینا کندن اور اس کے رفقا کا کام تھا۔

اس کے بعد اتنی بڑی پارٹی کو سجانے اور کھانے پینے کی اشیاء کو حسب منشاء میزوں پر چن دینا دوسرے کندنوں کا کام تھا۔ انھوں نے ان پارٹیوں کا انتظام حسب معمول اس خوش اسلوبی سے کیا جیسے معلوم نہیں کتنی دیر پہلے سے وہ اس اہتمام میں مصروف تھے، اور معلوم نہیں کیسے اور کہاں انھوں نے اس فن میں دستگاہ پیدا کی تھی۔ علی گڑھ میں ہر فن مولا نہیں تو ہر فن کے مولا مل جائیں گے جو اپنی اپنی وادی کے مسلمہ طور پر امام مانے جاتے ہیں اور کام کتنا ہی دشوار اور بڑا کیوں نہ ہو اس کو اس خوش اسلوبی سے اتنا جلد انجام دیں گے جیسے ان کے پاس جادو کی کوئی چھڑی ہو یا موکل قبضے میں ہو۔

یونیورسٹی میں نجی تقریبیں بھی چھوٹے بڑے پیمانے پر ہوا کرتی ہیں۔ نشستوں کے لیے میز کرسی کی فراہمی کا انتظام کندن کے سپرد ہوتا تھا۔ بڑے سے بڑے پیمانے پر جتنی جلدی اور جس خوبی سے وہ یہ سب انتظام کر دیتا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا فرنیچر صحیح وسالم اپنی اپنی جگہ پر واپس پہنچا دیتا وہ صرف اسی کے بس کی بات تھی۔ چیخ پکار نہ دوڑ دھوپ نہ تو تکار، کام اس طرح انجام پاتا جیسے کام کیا نہیں جا رہا ہے بلکہ خود ہوتا جا رہا ہے جیسے دن رات کا تواتر۔ ساتھی کام کرنے والوں کا جتنا پکا تعاون کندن کو نصیب تھا کم دیکھنے میں آیا۔ کبھی بعض ممبران اسٹاف کو کہیں سے فرنیچر منگانے یا ملنے میں نزاکتوں کا سامنا ہوتا، یہ مرحلہ کندن بڑی آسانی سے طے کر لیتا، اس کا کسی شعبہ میں جا کر محض یہ کہہ دینا کافی ہوتا تھا کہ فلاں صاحب کے ہاں فلاں تقریب ہے، فرنیچر چاہیے۔ اس کہنے کو کوئی نہیں ٹالتا تھا۔ حجت یا ٹال مٹول تو اس سے کی جاتی جس کے ہاں تقریب تھی۔ لیکن مانگنے والا تو کندن تھا۔ وہ ہر ایک کی خدمت کر چکا تھا، اس کو کون نہ مانتا۔

میرا خیال ہے کندن شاید اس سے زیادہ نہیں جانتا تھا کہ ٹوٹے پھوٹے ہندی رسم خط میں کچھ ہندسے یا ایک آدھ عبارت نوٹ کر لیتا ہو لیکن اس کی اٹکل اور قوت حافظہ غیر معمولی تھی۔ اپنے کاموں کے علاوہ مدتوں وہ امتحان کے دفتر میں بہت سے کام انجام دیتا رہا۔ اس دفتر میں کام کرنے کی ذمہ داری ہر شخص کے سپرد نہیں کی جاسکتی تاوقتیکہ اس پر کامل بھروسہ نہ ہو۔ کندن کی ایمانداری اور راست بازی ہر شخص کے نزدیک اتنی مسلم اور مستحکم تھی کہ امتحان کے دفتر ہی کا نہیں دوسرے سرکاری نیم سرکاری اور پرائیوٹ کام بے تکلف سپرد کر دئے جاتے تھے۔ کندن کے بیان پر کوئی جرح نہیں کرتا تھا۔ وہ جو کہہ دیتا لوگ مان لیتے۔ دفتر نے ایک بار بالکل نئی سرکاری بائیسکل پر اسے بینک یا سنٹرل پوسٹ آفس کسی ضروری کام سے بھیجا۔ کندن نے آکر بتایا کہ سائیکل کوئی اٹھا لے گیا۔ اس کی اطلاع تو احتیاطاً پولیس کو کر دی گئی لیکن یونیورسٹی میں کسی نے کندن سے سوال جواب نہیں کیا۔ یہ بات مان لی گئی کہ سائیکل چوری ہوگئی اور بس۔

امتحان کے کاپیوں کا ایک بنڈل کسی ممتحن کے پتے پر باہر بھیجا گیا، کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ ممتحن کو وہ پارسل نہیں ملا۔ وہاں کے ریلوے کے دفتر سے پوچھا گیا تو جواب آیا کہ پارسل سرے سے وصول ہی نہیں ہوا، یہ بہت بڑا اسٹیشن تھا، جہاں کے گودام میں پارسلوں کی

ایسی کثرت ہوتی ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہو جائے تو کسی خاص پارسل تک رسائی ناممکن ہو جاتی ہے۔

اس مہم پر کندن کو مامور کیا گیا۔ اس نے جا کر اسٹیشن پر ادھر ادھر دریافت کیا۔ بابوؤں نے جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے کبھی انکار کیا، کبھی ٹالنا چاہا، بالآخر کندن نے وہ تیور اور لہجہ اختیار کیا جو کبھی کبھی بہ درجہ مجبوری وہ یہاں اپنی سفر مینا کے بعض ممبروں سے اختیار کرتا تھا اور کہا کہ پارسل گھر میں لے چلو میں خود تلاش کر لوں گا۔ یہ آفر یا چیلنج ان کو قبول کرنا پڑا۔ اس نے جا کر پارسلوں کے جنگل میں سے اپنا پارسل پہچان کر نکال لیا۔ امتحان کا زمانہ تھا، امتحان ہی کے طرح طرح کے بے شمار دوسرے پارسلوں کے علاوہ یکساں رنگ کے معلوم نہیں کتنے اور پارسل کہاں کہاں سے آئے ہوئے تلے اوپر گڈمڈ رکھے ہوں گے۔ انھیں سے کندن کا اپنے پارسل کو دریافت کر لینا کتنے اچنبھے کی بات ہے۔

۱۹۴۷ کی قیامت برپا تھی۔ علی گڑھ کے نواح میں قتل غارت گری کی جیسی ہوش ربا خبریں آتی تھیں اور ہر طرف مایوس اور درماندگی کا جو عالم طاری تھا اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس زمانے میں یہاں تھے۔ کندن کا مکان دودھ پور میں تھا۔ جو یونیورسٹی سے ملا ہوا ایک مختصر سے گاؤں کی شکل میں اس سڑک کے ہر دو طرف آباد ہے جو یونیورسٹی فارم کو چلی گئی۔ یونیورسٹی کھلی ہوتی تو تقریباً ہر روز کندن سے دوچار ہونے کا اتفاق ہو جاتا۔ پوچھتا کہو کندن کب تک یہ خون خرابا رہیگا۔ گاؤں میں کیا خبر ہے، کندن سر جھکا لیتا جیسے ندامت اور رنج کے بوجھ سے دبا جا رہا ہو۔ کہتا ہجور کالج پر سید صاحب کی دعا ہے۔ سب کھیریت رہے گی۔ کالج کا بڑا نمک کھایا ہے، پرمیسر لاج رکھ لے! اس زمانے میں میں نے کندن سے زیادہ مضطرب یونیورسٹی میں کسی اور ہندو کو نہ پایا، جیسے واقعی وہ اپنے آپ کو ''سید صاحب'' کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہو۔

اس زمانے میں یونیورسٹی کے ایک مسلمان گھرانے کے بچے دہلی کے ایک ایسے محلے میں گھر گئے جہاں حادثے وقوع میں آ رہے تھے۔ نہ کوئی جا سکتا تھا نہ وہاں سے کوئی باہر نکل سکتا تھا۔ کسی طرح کی مدد کہیں سے پہنچانے کی سبیل نہیں نکلتی تھی۔ علی گڑھ میں خاندان والے جس بے قراری کے عالم میں تھے، وہ بیان سے باہر ہے۔ اس واقعے کا علم کندن کو ہوا تو اس نے بے تکلف اپنی خدمات پیش کر دیں، صورت حال ایسی تھی کہ اس مہم میں خود کندن کی جان کا خطرہ کچھ کم نہ تھا لیکن اس نے اس پر بالکل دھیان نہیں دیا۔ اتا پتا دریافت کیا اور بے محابا دلی کی آگ میں کود پڑا۔ سب کو نکالا اور بہ حفاظت تمام علی گڑھ لا کر ان کے گھر پہنچا دیا۔ کیسے کیسے خطرات کا کس دلیری اور عقلمندی سے کہاں کہاں اس نے مقابلہ کیا اس کا ذکر اس نے خود کبھی نہیں کیا لیکن جن کو چھڑا لایا تھا وہ بتاتے تھے کہ کندن پر کب کیا گزری۔

کندن نے اس یونیورسٹی میں اپنے تمام چھوٹے بڑے ہم مذہبوں کی طرف سے یہ خدمت ایسی انجام دی ہے جس کو بھلایا نہیں جا سکتا اور وہ لوگ تو خاص طور پر نہیں بھول سکتے جن پر وہ زمانہ گزرا ہے۔ بڑے آدمی چھوٹی بات کر کے بھی بڑے بنے رہتے ہیں۔ چھوٹا آدمی بڑے کام کر کے بھی چھوٹا ہی رہ جاتا ہے۔ اسے کیا کہیے یا کہہ کر کوئی کیا کرے گا۔

عرصے بعد حالات کچھ راہ پر آئے تو ایک دن یونیورسٹی میں صدا سنائی دی کہ قلندروں نے کندن کو دودھ پور کا راج پرمکھ قرار دے دیا۔ پوچھا، کیوں کندن چپکے چپکے راج پرمکھ بن گئے، خبر نہ کی۔ بولا ہجور، یہ لڑکے ہیں ناجب چاہیں خود راج پرمکھ بن جائیں۔ جب چاہیں دوسرے کو بنا دیں۔ ان کا کیا؟

اسٹریچی ہال کے دائیں بائیں زینے دار دو راستے ہیں جن کے سروں پر عالی شان کھلے محرابی دروازے ہیں جن سے سید محمود اور سرسید کورٹ میں آمد و رفت رہتی ہے۔ ان راستوں سے متوازی آمنے سامنے سہ دریاں ہیں جن کے پہلو میں ایک ایک کوٹھری ہے۔ ان میں سے ایک کندن کے قبضے میں تھی۔ معلوم نہیں کب سے۔ یونیورسٹی کھلی ہو ادھر سے گزرے تو کندن اکثر سہ دری میں بیٹھا بیڑی پیتا یا کسی سے بات کرتا ملتا۔ اسٹاف کا کوئی ممبر ہو یا آفس کا کوئی عہدہ دار، دیکھ کر فوراً کھڑا ہو جاتا، سلام کرتا مزاج پوچھتا، کبھی کبھی یہ بھی پوچھ لیتا کہ کوئی خدمت ہو تو وہ بجالانے پر تیار تھا۔ جب تک دروازے سے گزر نہ جائیں کھڑا رہتا۔ تکریم کے خیال سے بھی اور شاید ذمہ داری کے اس تقاضے کے بنا پر بھی جس کا ممکن ہے نیم شعوری طور پر احساس ہو کہ اس کی عملداری سے آپ خیریت سے خوش خوش گزر جائیں۔

عمر ستر کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ شکل سے پچاس سے زیادہ کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی اس طرح کا احساس بھی ہوا جیسے کندن کی عمر ایک خاص حد پر آ کر ٹھہر گئی ہو۔ کم سے کم مجھے اس کے قوی شکل وصورت اور رفتار و گفتار میں عرصے سے نمایاں تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔ ممکن ہے جسے روز دیکھتے اور عزیز رکھتے ہوں وہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہو۔

درمیانہ قد، گندمی رنگ، پتلا نقشہ، معمولی جثہ، مضبوط جسم، گھنٹے ہی کی طرح بجتی ہوئی پاٹ دار آواز، چہرہ بشرہ شریفانہ اور مردانہ۔ کس بلا کا مستعد اور محنتی یہ شخص تھا۔ نہ دن دیکھتا نہ رات، نہ سردی نہ گرمی، نہ بارش۔ کبھی کوئی کہتا، کندن بوڑھے ہوا تنی محنت نہ کیا کر تو وہی کلمہ دہرا دیتا جو اس کا تکیہ کلام سا بن گیا تھا یعنی ''ہجور کالج کا نمک کھایا ہے۔ پرمیشر نباہ دے۔''

یونیورسٹی کی دی ہوئی وردی خاکی یا بھورے رنگ کا کوٹ کبھی پاجامہ کبھی دھوتی پہنے اپنی عملداری میں وکٹوریا گیٹ سے لے کر باب اسحٰق تک گشت لگاتا رہتا۔ آج وہ فضا ان لوگوں کو کتنی سونی اور سوگوار معلوم ہوتی ہوگی جنھوں نے ۳۰-۳۵ سال تک مسلسل کندن کو کام کرتے اور اس نواح میں چلتے پھرتے دیکھا تھا۔ اور اس کی موجودگی کو یونیورسٹی کے اہم اور غیر منقطع معمولات سے تعبیر کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔

ایک دن میں نے کہا کندن تم اپنے اس بارہ ماسی یونی فارم (بھورے کوٹ) میں خاص طور سے جب اپنی پلٹن کے ساتھ کام پر ہوتے ہو تو نپولین جیسے معلوم ہوتے ہو۔ نپولین کو جانتے ہو کون تھا۔ بولا، میں جاہل کیا جانوں۔ میں نے کہا ہسٹری ڈپارٹمنٹ تمہارے سائے میں بسا ہوا ہے، کسی دن وہاں پوچھ آنا۔ ایک زمانے میں کالے کوسوں دور ولایت میں تمہارے ہی طرح وہ بھی گھنٹے بجاتا رہتا اور کلاس کے طالب علموں کی طرح وہاں کے لوگوں اور وہاں کی راجدھانیاں الٹ پلٹ ہوتی رہتیں۔

آخر زمانے میں کندن نے اپنے لیے ایک بڑا اور اچھا سا گھر بنوانا شروع کر دیا تھا۔ ''کالج کا نمک کھانے کا'' ایک تصرف یہ بھی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص چاہے وہ منصب یا دولت کے اعتبار سے چھوٹا ہو یا بڑا تقریب منانے، تعلیم دلانے اور مکان بنانے کا منصوبہ بڑے ہی پیمانے پر باندھتا ہے۔ ستم یہ کہ اپنا ہی نہیں دوسرے کا کام بھی اسی پیمانے پر کرنے کرانے یا دیکھنے کا جی چاہتا ہے۔ اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے لیکن اب تک اس ''حرکت'' سے کسی کو باز آتے نہیں دیکھا گیا۔

کندن کی نظر اور نگرانی میں سرسید کی بنائی ہوئی عمارتیں رہیں۔ اسٹریچی ہال کا وہ تنہا تمام عمر کلید بردار رہا، یہ مضبوط شاندار تاریخی عمارتیں اس کے ذہن و دماغ پر مستولی تھیں، زندگی بھر وہ انہی عمارتوں میں بیدار رہا۔ کالج کی تمام تقریبوں کی بساط وہی بچھاتا۔ ظاہر ہے ان عوامل کا اثر اس کے فکر و عمل پر کیسا پڑا ہوگا۔ ''کالج کا نمک کھانے'' کا ایک اور اثر بھی ہے، سب اثروں سے زیادہ کاری اور خطرناک جو کندن کیا وقت پر سبھی بھول جاتے ہیں یا خاطر میں نہیں لاتے، وہ یہ کہ جتنا بڑا منصوبہ ذہن میں آتا ہے اس کو پورا کرنے کے وسائل اتنے ہی محدود ہوتے ہیں۔ کندن بھی اسی تقدیر کا شکار ہوا۔

تعمیر کے اخراجات آمدنی کی رفتار اور مقدار سے دن بہ دن تیزی سے بڑھنے لگے۔ اسی اعتبار سے فکر اور پریشانی میں اضافہ ہوا۔ اس کے قریب جو لوگ تھے، ان کا بیان ہے کہ اس تعمیر کے چکر میں کندن ادھ موا ہو گیا تھا۔ اقربا کی بے مہری اور سخت گیری نے بقیہ کمی بھی پوری کر دی۔ ایسے میں ایسا ضرور ہوتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے نا قابل تسخیر کندن نے کہاں پہنچ کر شکست قبول کی۔ شاید کندن کو بچایا جا سکتا تھا۔

کندن کے بارے میں جیسے خیالات ذہن میں آئے اور جس طرح کے جذبات امڈے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس طرح کر سکتے ہیں کہ اس کی جن باتوں سے اور مدت العمر کی غیر منقطع وفا شعاری اور فرض شناسی سے جو تاثرات ایک نارمل شخص کے دل میں بے اختیار طاری ہو جاتے ہیں ان کو روکا جا سکتا ہے یا ان سے روگردانی کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں کی جا سکتی تو آج بالکل دنیا کا چاہے جیسا رنگ ڈھنگ ہو کندن کی یاد تازہ رہے گی۔ ہم میں بہت سے ایسے ہوں گے بالخصوص نو وارد جو اس سے واقف نہ ہوں گے، وہ تو خیر گھنٹہ بجانے والا ایک معمولی شخص تھا۔ یہ ادارہ اب اتنا پھیل گیا ہے اور پھیلتا جا رہا ہے کہ خود اسٹاف کے بہت سے اراکین آج یا کل ایک دوسرے سے واقف نہ ہو پائیں گے۔ اس صورت حال پر ماتم کرنا ثواب کا کام نہیں ہے، لیکن اس کو کیا کیجیے کہ جب تک ہم ''گزشتہ سے پیوستہ'' میں گزشتہ کا ذکر خیر ایک ایسی روایت ہے (اور یہی ایسی روایت ہے) جو نہ اب تک بدلی ہے نہ کبھی بدلیگی۔

آج کی دنیا میں یہ بات خاص طور پر دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ اتنی دیر تک نئی نہیں رہتی جتنی جلد پرانی ہو جاتی ہے، یہ سائنس کے نت نئے انکشافات اور ایجادات کا کرشمہ ہے۔ پرانی دنیا میں زیادہ دیر تک پرانی بنے رہنے کی صلاحیت تھی۔ پرانی دنیا کی یہ بات قابلِ فخر ہے یا نئی دنیا کی وہ، اس پر یہاں کون بحث کرے۔ قابلِ لحاظ اور قابل فخر تو وہ شخصیتیں ہیں جو نئی پرانی کی قید سے آزاد ہوتی ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت کندن کی تھی۔

مجتبیٰ حسین

یادوں میں بسا آدمی ۔مخدوم محی الدین

پچیس چھبیس برس اُدھر کی بات ہے۔مخدوؔم محی الدین ''انڈر گراؤنڈ'' تھے اور میں مڈل اسکول کا طالب علم تھا۔اُن دنوں بھی مجھے اتنی ہی انگریزی اور اردو آتی تھی جتنی کہ آج آتی ہے۔لہٰذا میں اپنے تئیں ''انڈر گراؤنڈ'' کا آسان ترجمہ ''زیر زمین'' کر کے گھنٹوں حیران رہا کرتا تھا کہ مخدوم بھائی آخر زیر زمین رہ کر کیا کرتے ہیں۔ مجھے تو وہ ''یکے از معدنیات'' قسم کی کوئی چیز لگتے تھے۔ بھلا ایک آدمی کو خواہ مخواہ ''زیر زمین'' جا کر رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ترجمے کی یہ غلطی مجھ سے بچپن میں سرزد ہوئی تھی مگر جب بڑے ہوئے تو کہیں پڑھا کہ پاکستان کے ایک شاعر سے ترجمے کی یہ غلطی توعین جوانی میں سرزد ہوئی تھی۔جن دنوں بنّے بھائی،یعنی سجاد ظہیر پاکستان میں پارٹی کی سرگرمیوں کے سلسلہ میں روپوش تھے۔تاجکستان کے مشہور شاعر مرزا ترسوؔن زادہ پاکستان کے دورے پر آئے اور ایک پاکستانی شاعر سے فارسی میں پوچھا ''سجاد ظہیر کجا است؟''

پاکستانی شاعر نے بڑی روانی کے ساتھ فارسی میں ترکی بہ ترکی جواب دیا ''سجاد ظہیر زیر زمین است'' یہ سنتے ہی مرزا ترسوؔن زادہ کی آنکھوں میں کم وبیش اتنی ہی روانی کے ساتھ آنسو آ گئے۔بولے ''یہ کب ہوا؟ ہمیں تو کچھ بھی پتہ نہ چلا۔آخر انھیں کیا بیماری ہوگئی تھی۔''

پاکستانی شاعر کو اچانک اپنی فارسی دانی کا احساس ہوا تو ہاتھوں اور بھنوؤں کے اشارے سے ماقبی فارسی بولتے ہوئے مرزا ترسوؔن زادہ پر ''زیر زمین'' اور ''روپوش'' ہونے کے نازک فرق کو واضح کیا۔اسی طرح مخدوم بھی میرے لئے ایک عرصہ تک ''زیر زمین'' ہی رہے اور کسی نے میری غلط فہمی دور نہیں کی۔

پھر جب ہم نے شعور سنبھالنا شروع کیا تو احساس ہوا کہ مخدوؔم بڑی تیزی سے ہمارے شعور کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔پھر حصہ بنتے بنتے وہ مکمل شعور ہی بن گئے۔مخدوؔم سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ میرے ایک دوست مخدوؔم کے مجموعہ کلام ''سرخ سویرا'' کو رحل پر رکھ کر نہ صرف پڑھا کرتے تھے بلکہ مطالعے کے دوران میں آگے اور پیچھے جھولتے بھی تھے۔ ہے کوئی شاعر جس کا کلام اس طرح پڑھا گیا ہو؟

صاحبو! وہ بھی کیا دن تھے۔ ہر صبح بستر سے جاگتے ہی آسمان پر نظر جاتی تھی کہ کہیں سرخ سویرا'' تو نہیں آ گیا۔جی چاہتا اپنے ملک میں بھی ایک عدد ''انقلاب روس'' لے آئیں۔انقلاب کے انتظار میں سگریٹیں پی پی کر کئی راتیں گزاریں۔ ہمارا سوشلزم وہی تھا جو مخدوم اور فیضؔ کی شاعری، کرشن چندر کے افسانوں ،سجاد ظہیر اور سردار جعفری کی تحریروں کے وسیلے سے ہم تک پہنچا تھا۔ گویا یہ خالصتاً اردو سوشلزم تھا۔مگر ہم حیدرآبادیوں کے لئے مخدوؔم صرف شاعر اور دانشور نہیں تھے بلکہ بہت کچھ تھے۔مخدوم کی زیر زمین رہنے کی عادت کی وجہ سے ان کی شخصیت کے اطراف ایک عجیب سا سحر پیدا ہو گیا تھا۔یار لوگوں نے ان کے بارے میں باتیں بھی کچھ ایسی ہی پھیلا رکھی تھیں کہ کبھی کبھی مخدوم ایک مافوق الفطرت شے دکھائی دیتے تھے،کہا جاتا تھا کہ مخدوؔم بیک وقت چار مختلف مقامات پر موجود رہتے ہیں۔اگر چار

میں بانٹ رہے ہیں، اور پھر ٹھیک اسی سمے حیدرآباد کے ایک محلّہ میں اپنے ایک دوست کو اپنی تازہ نظم سنا رہے ہیں۔ اور پھر اسی وقت اب خیر جانے بھی دیجیے ایسی باتیں کہاں تک سنائی جائیں۔ مخدومؔ کے بارے میں اس قسم کے انکشافات کو سن کر ہمارے کمسن اور نوخیز خون کی جو حالت ہوتی ہوگی اس کا اندازہ آپ خود بھی لگا سکتے ہیں، خون رگوں میں ابلا پڑتا تھا جسے بعد میں مخدوم کے کلام کے ذریعے ہی ٹھنڈا کیا جاتا تھا۔ علاج بالمثل اسی کو کہتے ہیں۔ اس وقت تک مخدوم کو نہیں دیکھا تھا حالانکہ ان کے آجگہ (OMNT PRESENT) ہونے کی اتنی ساری افواہیں سن رکھی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ مخدوم جب قید سے رہا ہوئے تو ہمیں اطلاع ملی کہ وہ شاہ آباد میں مزدوروں کے ایک جلسے سے خطاب کرنے کے لئے آرہے ہیں۔ ان دنوں میں گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ جس شاعر کا کلام اپنے لئے وظیفہ تھا اور جس کی تصویر سرا اول کے آئینہ میں رکھی رہتی تھی اُس کے شاہ آباد آنے کی اطلاع ملی تو رگوں میں خون کچھ اس زور سے ابلا کہ میں اور میرا وہ دوست جو ''سرخ سویرا'' کو رحل پر رکھ کر پڑھا کرتا تھا اسٹیشن کی طرف سے بھاگے۔ معلوم ہوا کہ شاہ آباد جانے والا مدراس میل ابھی جا چکا ہے، انکوائری سے پوچھا کہ شاہ آباد کا یہاں سے کتنا فاصلہ ہے۔ جواب ملا ۲۵ کلومیٹر۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے۔ آج عشق، آتش نمرود میں کود پڑے گا اور ۲۵ کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کرے گا۔ اپنے جنون کی کہاں تک تشہیر کی جائے۔ یہ ہماری زندگی کی پہلی اور آخری لانگ مارچ تھی۔ مگر شاہ آباد پہنچے تو معلوم ہوا کہ مخدومؔ آئے بھی اور چلے بھی گئے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ماتھے پیٹ کر چپ ہو رہے۔ مگر مخدومؔ مافوق الفطرت تو تھے ہی۔ انہیں غالباً کسی غیبی طاقت نے بتا دیا تھا کہ گلبرگہ میں دو روحیں اُن سے ملنے کے لئے بیتاب ہیں، لہٰذا پندرہ دن بعد مخدوم گلبرگہ چلے آئے۔ مزدوروں کے کسی جلسے کو مخاطب کرنے۔ جلسے کے بعد کالج کے نوجوانوں نے انھیں گھیر لیا۔ مجھے یاد ہے وہ پورے چاند کی رات تھی۔ ایسا روشن چاند ہم نے زندگی میں پھر کبھی نہیں دیکھا۔ گلبرگہ کے مومن پورہ میں ایک بزرگ کے مزار کے سامنے ایک چبوترے پر مخدوم ہم نوجوانوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ آدھی رات بیت چکی تھی اور مخدوم ہم سب کو کلام سنا رہے تھے۔ ''سرخ سویرا'' تو ہمیں زبانی یاد تھا ہی لہذا ہم نے کہا، ''مخدوم بھائی اپنا کوئی غیر مطبوعہ کلام سنایئے۔'' بولے ''ہیں غیر مطبوعہ کلام نہیں کہتا۔ ہمیشہ مطبوعہ کہتا ہوں''۔

پھر میں حیدرآباد آیا۔ مخدوم سے ان گنت ملاقاتیں ہوئیں۔ پھر یوں ہوا کہ کئی برس بعد ایک دن میں، پروفیسر حسن عسکری اور مخدوم حیدرآباد کے ویکاجی ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ مجھے مخدومؔ سے ملنے کا وہ پہلا اور اچھوتا اشتیاق یاد آیا۔ میں نے مخدوم سے کہا۔ مخدوم بھائی! آپ کو پتہ نہیں کہ کئی برس پہلے آپ سے ملنے کے لئے میں اور میرے ایک ساتھی نے گلبرگہ سے شاہ آباد تک پیدل سفر کیا تھا۔

یہ سنتے ہی نہایت رازداری کے انداز میں بولے ''اچھا تو اب ملو۔ بتاؤ کیا کام تھا تمھیں مجھ سے؟۔ کوئی خاص بات تھی کیا؟''

مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ میں نے کہا ''مخدوم بھائی! اب تو مجھے یاد نہیں رہا کہ میں اُس وقت آپ سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔ زندگی کے سفر میں بہت سی باتیں، بہت سی خواہشیں اور بہت سے کام یونہی اوجھل ہو جاتے ہیں۔''

بولے ''یاد کر کے بتانا۔ تمہارا حافظہ خاصا کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ اور ہاں آئندہ کبھی پیدل چلنے کی غلطی نہ کرنا۔'' یہ کہہ کر مخدوم نے زوردار قہقہہ لگایا۔ مجھے آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ مخدوم نے یہ قہقہہ مجھ پر لگایا تھا یا اپنے آپ پر۔ بعض قہقہوں کے مبدا کا سراغ لگانا بہت

دشوار ہوتا ہے، اپنی بات کو ختم کر کے مخدوم نے مجھ سے اور حسن عسکری سے زوردار مصافحے کئے۔ اُن کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی چبھتا ہوا فقرہ کہتے اور مذاق کی کوئی بات کہتے، جو ہوہ اکثر کہتے تھے تو مخاطب سے مصافحہ ضرور کرلیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی مخدوم روبرو ہوتے تو میں بائیں ہاتھ سے سگریٹ پیتا تھا اور دائیں ہاتھ کو مصافحے کے لئے ریزرو رکھتا تھا۔ ایک بار مجھے اور مخدوم کو ایک ادبی تقریب میں شرکت کے لئے بمبئی جانا پڑ گیا۔ حیدرآباد کے اسٹیشن پر میں پہنچا تو میرے ایک ہاتھ میں اٹیچی کیس تھا اور دوسرے ہیں ہولڈول۔ مخدوم نے مجھے دیکھتے ہی مصافحہ والا فقرا کہہ دیا اور میں نے اٹیچی کیس کو نیچے رکھ کر ان سے مصافحہ کیا۔ پھر انھوں نے تابڑتوڑ کئی بار مصافحہ فقرے کہہ کر مجھ سے اٹیچی کیس کو نیچے رکھوایا میں ان کے فقروں سے ایسا الرجک ہوا کہ ابھی وہ آدھا فقرہ ہی کہتے تھے کہ میں اٹیچی کیس کو نیچے رکھ دیتا تھا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر بولے ''بیٹا! اب تو تم میرے ایسے فقروں پر بھی اٹیچی کیس نیچے رکھنے لگے ہو جن پر میں مصافحہ نہیں کرتا۔ تم خود ورزش کرنا چاہتے ہو تو کرو۔''

یہ کہہ کر مجھے اٹیچی کیس نیچے رکھنے کا حکم دیا۔ مصافحہ کیا اور بولے ''خبردار جواب کبھی اٹیچی کیس نیچے رکھا۔'' اور اس کے بعد پھر مصافحے کی منزل آ گئی۔

مخدوم کی بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی کے بے شمار واقعات مجھے یاد ہیں۔ اپنا مذاق آپ اُڑانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ایک بار علی الصبح اورینٹ ہوٹل میں پہنچ کر بیرے سے پوچھا ''نہاری ہے؟''

بیرا بولا ''نہیں ہے؟''

مخدوم نے پوچھا" آملیٹ ہے؟"

بیرا بولا ''نہیں ہے؟''

مخدوم نے پوچھا ''کھانے کے لئے کچھ ہے؟''

بیرا بولا ''اس وقت تو کچھ بھی نہیں ہے''

اس پر مخدوم بولے ''یہ ہوٹل ہے یا ہمارا گھر کہ جہاں کچھ بھی نہیں ہے۔''

ان کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی نئی غزل کہتے تو اسے سنانے کے لئے دوڑ پڑتے تھے۔ اپنی اس عادت سے متعلق خود ہی ایک لطیفہ سنایا کرتے تھے۔

ایک دن اُن سے غزل ہوگئی تو فوراً اورینٹ ہوٹل چلے آئے کہ کوئی مائی کا لال مل جائے تو اسے غزل سنائیں۔ یہاں کوئی نہ ملا تو ''صبا'' کے دفتر چلے گئے۔ وہاں بھی کوئی نہ ملا۔ تھک ہار کے چائینیز بار میں چلے گئے۔ بار کے بیرے قاسم کو بلا کر کہا ''دو پیگ وہسکی لے آؤ'' قاسم وہسکی لے آیا تو اُس سے بولے ''بیٹھی اور وہسکی پیو''۔ قاسم شرماتا رہا مگر وہ مُصر رہے۔ اُس نے کھڑے کھڑے وہسکی پی لی۔ پھر بولے ''دو پیک وہسکی اور لے آؤ''۔ دوسرے دور میں بھی انہوں نے قاسم کو وہسکی پلائی پھر تیسرا دور چلا۔ اس کے بعد مخدوم نے قاسم سے کہا۔

''اچھا قاسم اب میرے سامنے بیٹھو۔ میں تمہیں اپنی تازہ غزل کے کچھ شعر سنانا چاہتا ہوں۔'' یہ سنتے ہی قاسم نے کہا'' صاحب! آپ بہت پی چکے ہیں۔آپ کی حالت غیر ہورہی ہے۔ چلئے میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں''۔

مخدوم کہا کرتے تھے کہ اپنی ہوشمندی کے ہزار ثبوت پیش کرنے کے باوجود قاسم نے اس رات ان کی غزل نہیں سنی۔ یہ لطیفہ سنا کر خود ہی ہنستے تھے اور مخاطب سے زوردار مصافحہ کرتے تھے۔

یہ لطیفہ بھی مخدوم ہی سنایا کرتے تھے جو اُن کے دور روپوشی سے متعلق ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک بار یہ اپنے ایک برہمن دوست کے گھر روپوش ہوگئے۔ ان کا برہمن دوست بھی پارٹی کا ممبر تھا۔ اُن کے دوست نے ان سے کہہ رکھا تھا کہ'' مخدوم بھائی میرے والد بڑے قدامت پرست ہیں۔ اسی لئے ان پر کبھی یہ ظاہر نہ کرنا کہ آپ برہمن نہیں ہیں۔ اپنی برہمنیت کی لاج رکھنا۔''

ایک دن ان کے دوست کے والد نے مخدوم سے کہا'' بھئی! تم لوگ کمیونسٹ پارٹی میں ہو۔ تمہارے دھرم کا کوئی بھروسہ نہیں کہیں تم گوشت تو نہیں کھاتے؟''

مخدوم نے جھٹ سے کہا" لاحول ولاقوۃ۔ یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ میں گوشت کھاتا ہوں۔ نعوذ باللہ یہ تو مجھ پر سراسر تہمت ہے۔''

اس نان وبجٹیرین جملے کے بعد ان کی روپوشی کا کیا بنا اس کے بارے میں مخدوم کچھ نہیں کہتے تھے۔ وہ جہاں خوش مذاقی اور شگفتہ مزاجی کا پیکر تھے وہیں عقیدے کے معاملے میں بے حد سنجیدہ ہو جاتے تھے۔ ہم نے اکثر دیکھا کہ وہ ہنستے کھیلتے سیٹی بجاتے خوش خوش اورینٹ ہوٹل آتے مگر ٹیبل پر بحث کے بعد جب جانے لگتے تو مٹھیاں بھینچی ہوتی تھیں، منہ سے کف نکل رہا ہوتا تھا اور آنکھوں سے شعلے برس رہے ہوتے تھے۔ اس اعتبار سے مخدوم بہت احتیاط سے برتنے کی چیز تھے۔ ذرا کوئی چوک گیا اور مخدوم کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

اُن کے انتقال سے دو برس پہلے کی بات ہے۔ حیدرآباد میں ایک عظیم الشان مشاعرہ برپا تھا۔ مخدوم ڈائس پر بیٹھے تھے اور ایک شاعرہ مائک پر کلام سنا رہی تھیں۔ ڈائس کے نیچے ایک لحیم شحیم شخص نشہ میں دھت بیٹھا شاعرہ کو گھورے جا رہا تھا۔ پھر اس کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ اس نے اچانک شاعرہ کی طرف چھلانگ لگائی۔ مخدوم نے بھی چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ اُس شخص کی طرف چھلانگ لگائی۔ سیکنڈوں میں اُس شخص کو ڈائس سے نیچے گرایا اور اس کے سینے پر سوار ہوگئے۔ میں کیسے بتاؤں کہ بیس پچیس برس بعد مخدوم کے اندر چھپے ہوئے انقلابی کو پھر ایک بار سرگرم عمل دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی۔ لوگوں نے مخدوم کی اس ادا کی داد بھی اسی طرح دی جس طرح ان کے کلام پر دیا کرتے تھے۔

وہ چھوٹوں کے ساتھ بہت شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ حیدرآباد کے کتنے ہی ادیبوں اور شاعروں کی ذہنی تربیت انھوں نے کی۔ سلیمان اریب، عزیز قیسی، اقبال متین، وحید اختر، جیلانی بانو، انور معظم، آمنہ ابوالحسن، استاد تمکنت، عاتق شاہ، عوض سعید اور مغنی تبسم یہ سب مخدوم سے متاثر تھے۔ وہ میری بھی ہر قدم پر ہمت افزائی کرتے تھے۔ چنانچہ مجھے ''مسخرا'' کہہ کر پکارتے تھے۔ اب اس سے زیادہ کوئی میری ہمت افزائی کر کے دکھا دے، اُردو کے مسخروں یعنی مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس ہوئی تو اس کا افتتاح انھوں نے ہی

فرمایا۔ میرے مضامین کے پہلے مجموعے کی رسمِ اجرا بھی انھوں نے ہی ازراہ تمسخر انجام دی تھی۔

ادیبوں سے وہ اُلجھتے بھی تھے۔ اس معاملے میں وحید اختر پر ان کی بڑی نظرِ عنایت رہا کرتی تھی۔ کبھی کبھی دوستوں کو جان بوجھ کر چھیڑتے بھی تھے۔ ایک رات سلیمان اریب کے گھر پر حیدرآباد کے مشہور آرٹسٹ سعید بن محمد سے کہا۔ ''شاعری، مصوری سے کہیں زیادہ طاقتور میڈیم ہے۔''

سعید بن محمد نے پرش بکف جواب دیا ''مصوری اور شاعری کا کیا تقابل۔ شاعری میں تم جو چیز بیان نہیں کر سکتے ہم رنگوں اور فارم میں بیان کر دیتے ہیں۔ تم کہو تو میں ساری اردو شاعری کو پینٹ کر کے رکھ دوں۔''

مخدوم بولے ''ساری اردو شاعری تو بہت بڑی بات ہے۔ تم اس معمولی مصرعے کو ہی پینٹ کر کے دکھا دو۔''

''پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے''

سعید بن محمد بولے ''یہ کونسی مشکل بات ہے۔ میں کینوس پر گلاب کی ایک پنکھڑی بنا دوں گا۔''

بولے ''پنکھڑی گلاب کی تو پینٹ ہوگئی مگر ''سی'' کو کیسے پینٹ کروگے؟''

سعید بن محمد بولے ''سی'' بھی بھلا کوئی پینٹ کرنے کی چیز ہے؟

مخدوم بولے ''مصرعے کی جان تو ''سی'' ہی ہے، سعید آج میں تمھیں جانے نہیں دوں گا جب تک تم ''سی'' کو پینٹ نہیں کروگے''

یہ سنتے ہی سعید بن محمد وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

مجھے اس وقت مخدوم کا وہ مضمون یاد آرہا ہے جو انھوں نے حیدآباد کے اردو ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بہ زبان انگریزی ''السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا'' میں لکھا تھا۔ مضمون کا چونکہ پہلے سے اعلان ہو چکا تھا اس لئے جس دن ویکلی کا شمارہ حیدرآباد پہنچا اردو ادیبوں اور شاعروں نے دھڑا دھڑ اس کی کاپیاں خرید لیں۔ نیوز پیپر اسٹال والا سخت حیران کہ اردو شاعروں کو آج کیا ہو گیا کہ انگریزی کا رسالہ خریدے چلے جارہے ہیں۔ میں عابد روڈ سے گزر رہا تھا کہ حیدرآباد کے ایک بزرگ شاعر ویکلی کا شمارہ ہاتھ میں پکڑے میرے پاس آئے اور کہنے لگے ''بھئی! اس میں مخدوم کا مضمون کہاں ہے بتاؤ؟''

میں نے مخدوم کا مضمون نکال کر بتایا تو بولے "اچھا اب یہ بتاؤ کہ اس میں میرا نام کہاں ہے؟ پہلے تو میں بڑی دیر تک اپنا نام مضمون میں تلاش کرتا رہا۔ یہ نہ ملا تو شاعر موصوف کا نام تلاش کرنے لگا۔ حسب توقع یہ بھی وہاں موجود نہ تھا۔ مگر اسی بیچ مجھے ایک شرارت سوجھی۔ میں نے سلیمان اریب کے نام کے نیچے ایک لکیر کھینچتے ہوئے شاعر موصوف سے کہا۔ ''لیجئے قبلہ اب یہ رہا آپ کا نام۔''

شاعر موصوف ویکلی کے شمارے کو سینے سے لگائے خوش خوش چلے گئے تھوڑی دور جانے کے بعد مخدوم انھیں مل گئے تو انہوں نے بڑی احسان مندی کے ساتھ مضمون میں اُن کا نام شامل رکھنے کا شکریہ ادا کیا۔

مخدوم نے کہا۔ قبلہ! آپ کو کس نے بتایا کہ آپ کا نام مضمون میں شامل ہے؟ وہ بولے ابھی ابھی مجتبیٰ نے مجھے بتایا ہے۔

مخدوم بولے ''مولانا! مجتبیٰ کو بھی اتنی ہی انگریزی آتی ہے جتنی کہ آپ کو آتی ہے۔ جائیے جائیے۔ آپ کا نام میں نے نہیں لکھا

ہے۔''

اس مضمون کے بعد حیدرآباد کے کئی نوجوان ادیبوں کو مخدوم سے شکایت ہوگئی۔ ایک دن اورینٹ ہوٹل میں یہی مضمون زیر بحث تھا۔ مخدوم بولے بھئی! ادیب اور شاعر کو اپنے نام اور شہرت سے بے نیاز رہنا چاہیے۔ اُس کا نام یا کلام کہیں چھپے یا نہ چھپے اُسے تو بے تعلق رہنا چاہئیے''۔ اس کے بعد بحث ختم ہوگئی اور دوسرے مسائل زیر بحث آ گئے۔ مگر اسی بیچ مجھے پھر ایک شرارت سوجھی میں نے بالکل ہی بے نیاز ہو کہ کہا ''مخدوم بھائی! آپ کی ایک نظم دلی کے ایک رسالے کے تازہ شمارے میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔''

پوچھا ''کونسے رسالے میں؟''

میں نے کہا ''مجھے نام تو یاد نہیں مگر عابد روڈ کے بس اسٹاپ والے بک اسٹال پر ابھی ابھی میں یہ رسالہ دیکھ کر آرہا ہوں۔''

مخدوم تھوڑی دیر تو انجان اور بے تعلق بنے رہے۔ پھر اچانک کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے جیسا کہ ان کی عادت تھی۔ پھر بولے ''اچھا اب چلتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔''

میرے ساتھ کچھ احباب بھی بیٹھے تھے۔ میں نے کہا ''مخدوم بھائی یہاں سے سیدھے بک اسٹال پر جائیں گے۔ چلو ہم بھی چلیں۔''

ہم لوگ بک انسٹال پر پہنچے تو مخدوم سچ مچ وہاں موجود تھے اور رسالوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ جونہی ہم پر ان کی نظر پڑی، انھوں نے فلک شگاف قہقہہ لگایا اور بولے ''کیوں بے مسخرے۔ ہم سے بدمعاشی کرتا ہے۔''

میں نے کہا ''مخدوم بھائی میں تو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ شاعر اپنے کلام سے اس حد تک بے نیاز رہ سکتا ہے۔''

مخدوم کو حیدرآباد سے بے پناہ پیار تھا، جسے وہ ہمیشہ ''وطن مالوف'' کہا کرتے تھے۔ حیدرآباد مخدوم کے اندر تھا اور مخدوم حیدرآباد کے اندر۔ حیدرآباد کی گلی گلی میں اُن کے چرچے تھے۔ حیدرآبادیوں نے انھیں ٹوٹ کر چاہا بھی۔ ڈاکٹر راج بہار گوڑ نے تو اپنے گھر کا نام ہی ''چنبیلی کا منڈوا'' رکھ چھوڑا تھا جو مخدوم کی ایک مشہور نظم کا عنوان ہے۔ لوگ اپنے گھروں کے نام رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر گوڑ نے اپنے گھر کا عنوان رکھا تھا۔ اگرچہ اپنے گھر میں معنویت پیدا کرنے کے لئے چنبیلی کی بیل بھی لگا رکھی تھی مگر اب بھی اُن کے گھر میں ''چنبیلی کا منڈوا'' کم اور مخدوم کی نظم زیادہ نظر آتی ہے۔

وہ ڈسپلن کے بڑے پابند تھے۔ سارا دن پارٹی کا کام کرتے اور شام کو تھوڑا سا وقت دوستوں میں گزارتے تھے۔ جہاں احساس ہوا کہ وقت ضائع ہو رہا ہے چٹ سے اُٹھ جاتے تھے اور محفل سے غائب۔ وہ دنیا سے گئے ابھی اسی طرح یعنی ایک دن چٹ سے چلے گئے۔

آخری مرتبہ جب وہ دہلی جا رہے تھے تو مجھ سے روزنامہ ''سیاست'' کے دفتر پہ ملے۔ میں نے پوچھا ''مخدوم بھائی! واپسی کب ہوگی؟ بولے یہی دو چار دن میں آجاؤں گا۔'' وہ بات کے بڑے پکے تھے۔ لہذا حیدرآباد واپس آئے مگر کچھ اس شان کے ساتھ کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے کندھوں پر سوار تھے۔ سیاسی کامرانیوں کے بعد مخدوم کا ڈاکٹر گوڑ کے کندھے پر سوار ہونا یا مخدوم کے کہنے پر ڈاکٹر گوڑ کا سوار ہونا کوئی نئی انہیں تھی مگر اس بار وہ ڈاکٹر گوڑ کے کندھے پر سوار ہوئے تو نیچے نہیں اترے ہمیشہ کے لئے سب کے دلوں میں ایک زخم بن

کراتر گئے۔مخدوم کے جنازے میں ہزاروں لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ایسا جنازہ کسی شاعر اور وہ بھی اُردو شاعر کو بھلا کہاں نصیب ہوگا۔اور یوں وہ پھر ''زیرزمین'' چلے گئے۔مگر اس بار وہ ''زیرزمین'' جاتے ہوئے،اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے گئے۔اپنا سب کچھ دنیا کو سونپ گئے۔اپنی شاعری،اپنا عقیدہ،اپنی باتیں،اپنے لطیفے،اپنی یادیں غرض سب کچھ---

مخدوم کے بارے میں اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ مخدومؔ ایک انسان نہیں تھے۔جیتا جاگتا سانس لیتا ہوا شہر تھے۔اس شہر کی ہم نے برسوں سیر کی،ہم سب اسی شہر میں آباد تھے۔

مخدومؔ کے انتقال کے بعد پہلی بار احساس ہوا کہ ''غریب الوطنی'' کس کو کہتے ہیں۔اس شہر میں کتنی سڑکیں تھیں،کتنی گلیاں تھیں،کتنے موڑ تھے اور یہ سب راستے انسانیت اور سچائی کی طرف جاتے تھے۔ (مئی ۱۹۷۸ء)

ڈاکٹر محمد عبید الرحمٰن

ام المومنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰ

مذہب اسلام میں کسی بھی خاتون کو وہ رتبہ وہ شرف حاصل نہیں جو حضرت سیدہ بی بی خدیجۃ الکبریٰ کو نصیب ہوا۔ وہ اس لئے کہ کفر و باطل کے گھنے بادلوں کو کاٹ کر جب آفتاب رسالت طلوع ہوا تو اس کی پہلی کرن نے انہیں کے سینہ کو منور کیا۔ تاریخ اسلام میں اولین مومن ہستی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی ذات اقدس تھی۔ آپ سرور کائنات رسول عربی ﷺ کی صرف رفیقۂ حیات ہی نہ تھیں، بلکہ ایسی حق شناس کہ ان کے ضمیر نے فوراً تصدیق کر دی کہ حضورؐ کو غار حرا میں رب العزت نے رسالت کا تاج بخش دیا۔ خوف و ہراس کے موقع پر تسکین دینے والی، قبول اسلام میں سبقت کرنے والی، آل رسول کا سلسلہ قائم کرنے والی، حضورؐ پر سب کچھ قربان کرنے والی، مرتے دم تک حضور کا ہاتھ بٹانے والی، رسالت کی بشارت دینے والی حضرت خدیجۃ الکبریٰ ہی تھیں۔ آپ ہی نے حضورؐ کی معاشی مشکلات کو دور کیا۔ آپ ہی نے حضور کو عبادت و ریاضت کی ساری سہولتیں فراہم کیں۔ آپ ہی نے غار حرا جیسی دشوار گذار پہاڑی تک چڑھ کر مہینوں حضور کی خدمت میں طعام پیش کرتی رہیں۔ سب سے بڑھ کر مخالفت کا جب طوفان اٹھا تو آپ ہی نے ہر قسم کے روح فرسا، خوں افشاں مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ حضورؐ کی رفاقت و جاں نثاری کا حق ادا کر دیا۔ آزمائش و امتحان کے سخت ترین مرحلوں کے دور میں تبلیغ حق کی راہ میں ہمت و استقلال کی چٹان کی طرح کھڑی ہو گئیں۔

آپ کا رتبہ اس بات سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ حضورؐ نے حسب معمول خدیجۃ الکبریٰ کی تعریف کرنی شروع کی۔ مجھے رشک آیا۔ میں نے کہا "یا رسول اللہ ﷺ وہ ایک بڑھیا بیوہ عورت تھیں۔ خدا نے ان کے بعد آپ کو ان سے بہتر بیوی عنایت کی"۔ یہ سن کر حضور کا چہرہ مبارک غصہ سے سرخ ہو گیا اور فرمایا "خدا کی قسم مجھے خدیجہ سے اچھی بیوی نہیں ملی۔ وہ ایمان لائیں جب سب لوگ کافر تھے۔ اس نے میری تصدیق کی جب سب نے مجھے جھٹلایا۔ اس نے اپنا زر و مال مجھ پر قربان کر دیا۔ جب دوسروں نے مجھے محروم رکھا اور اللہ نے اس کے بطن سے مجھے اولاد دی۔" حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ "میں ڈر گئی اس روز سے عہد کر لیا کہ آئندہ حضور کے سامنے کبھی خدیجۃ الکبریٰ کے متعلق کچھ نہ کہوں گی۔"

آپ کے والد کا نام خویلد بن اسد تھا۔ ان کے پڑ دادا عبد العزیٰ قصّی حضور کے جد امجد تھے۔ آپ کی ماں کا نام فاطمہ بنت زائدہ تھا۔ آپ کا نام خدیجہ، اور لقب طاہرہ تھا۔ "طاہرہ" کا لقب آپ کے اوصاف جمیلہ کی دلالت کرتا تھا جیسا کہ حضور کا لقب "امین" آپ کی سیرۃ مطہرہ کا مظہر تھا۔ یہ قدرت کا منشا تھا کہ طاہرہ "امین" کا جزلاینفک بن جائے۔ حضرت خدیجہؓ کے والد ایک کامیاب تاجر تھے۔ صرف اپنے قبیلہ میں ہی بڑی عظمت کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے تھے بلکہ تمام قریش میں اپنی خوش معاملگی و دیانت داری کی وجہ سے ہر دلعزیز و محترم تھے۔ حضرت خدیجہؓ بچپن ہی سے نہایت نیک اور شریف الطبع تھیں۔ ان کی پہلی شادی ابوہالہ سے ہوئی۔ اُن سے دو

لڑکے ہوئے۔ ابوہالہ کے انتقال کے بعد حضرت خدیجہ کی دوسری شادی عتیق بن عائذ مخزومی سے ہوئی۔ ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ عتیق بھی

انتقال کر گئے۔اس کے بعد آپ کا نکاح حضورؐ سے ہوا۔

حضورؐ سے نکاح سے قبل جب حضرت خدیجہ بیوہ تھیں تو آپ اپنا کچھ وقت خانہ کعبہ میں گزارتی تھیں۔قریش کے بڑے بڑے سرداروں نے انہیں نکاح کے پیغامات بھیجے،لیکن آپ نے ان سب کو رد کر دیا۔کیونکہ پے در پے صدمات نے ان کی طبیعت دنیا سے اچاٹ کر دی تھی۔ان کے والد کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔اس وقت ان کی تجارت ایک طرف شام تک اور دوسری طرف یمن تک پھیلی ہوئی تھی۔اس کاروبار کے لئے انہوں نے کئی عرب، یہودی، عیسائی ملازموں کو مقرر کر رکھا تھا۔یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضورؐ اپنے پاکیزہ اخلاق کی وجہ سے امین کے لقب سے مشہور ہو چکے تھے۔یہ بات حضرت خدیجہؓ تک بھی پہنچ چکی تھی۔ان کی تجارت کے لئے ایک ایسے ہی شخص کی سخت ضرورت تھی۔آپ نے حضور کو پیغام بھیجا کہ اگر آپؐ اس تجارت کو شام تک لے جایا کریں تو دوسرے لوگوں سے دوچند معاوضہ آپ کو دیا جائے گا۔آپؐ نے یہ پیغام قبول فرمایا اور تجارت کے لئے عازم بصرہ ہوئے۔آپؐ کی دیانت داری وسلیقہ شعاری کی بدولت تجارت چمک اٹھی۔ہر ایک حضورؐ کا مداح بن گیا۔حضرت خدیجہؓ بے حد متاثر ہوئیں اور لونڈی نفیسہ کی معرفت حضورؐ کو نکاح کا پیغام بھیجا۔حضورؐ اپنے چچا ابو طالب اور دیگر اکابر خاندان کے ساتھ حضرت خدیجہ کے مکان پر تشریف لائے۔حضرت ابو طالب نے نکاح کا خطبہ پڑھا۔اس وقت حضورؐ کی عمر پچیس سال کی اور خدیجہؓ کی عمر چالیس سال کی تھی۔

نکاح کے بعد حضورؐ اکثر مکہ کے پہاڑوں میں جا کر عبادت الٰہی میں مشغول رہتے۔اسی طرح دس برس کا زمانہ گزر گیا۔ایک دن اسی غار حرا میں معتکف تھے کہ جبرئیل امین آپؐ کے پاس تشریف لائے۔آپ کے سینہ کو داب کر اقراء کا سبق دیا۔حضورؐ نے فرمایا ''میں پڑھا لکھا نہیں''، جبرئیل نے پھر یہی کہا اور حضورؐ نے یہی جواب دیا۔تیسری مرتبہ جبرئیل نے کہا ''پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے جس نے سب کچھ پیدا کیا۔پڑھ تیرا پروردگار بہت رحم والا ہے جس نے قلم سے آدمی کو علم سکھایا جو نہ جانتا تھا۔'' یہ تھی پہلی وحی۔حضورؐ کی زبان مبارک پر یہی کلمات جاری ہو گئے۔یہ حیرت انگیز واقعہ تھا۔حضورؐ حیران پریشان گھر تشریف لے آئے۔حضرت خدیجہؓ سے کہا ''مجھے کمبل اڑھاؤ، مجھے کمبل اڑھاؤ''۔آپ پر خوف وہراس طاری تھا۔حضرت خدیجہؓ نے تسلی دی کہ آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟ آپ کہاں تھے؟ میں فکرمند تھی اور کئی آدمیوں کو آپ کی تلاش میں بھیج چکی تھی۔حضورؐ نے تمام واقعہ حضرت خدیجہؓ کے سامنے بیان کر دیا۔حضرت خدیجہؓ نے کہا آپ سچ بولتے ہیں،غریبوں کی مدد فرماتے ہیں۔مہمان نوازی کرتے ہیں۔امانت گزار ہیں۔سب کا دکھ درد دور کرتے ہیں۔رحم وکرم کرتے ہیں۔اللہ آپ کو تنہا نہ چھوڑے گا۔حضرت خدیجہؓ کا ضمیر کہہ رہا تھا کہ فیضان سماوی کا ظہور ہونے والا ہے۔عالم انسانیت پر فلاح و بہبودی کا انقلاب آنے والا ہے۔پھر آپ کو ساتھ لے کر اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس پہنچیں جو زبور وانجیل کے بڑے عالم تھے۔بت پرستی ترک کر کے عیسائی ہو گئے تھے۔

ورقہ نے جب سارا ماجرا سنا تو فوراً بول اٹھے ''یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰ'' پر اترا تھا۔اے کاش کہ میں اس زمانے تک زندہ رہتا جب آپ کی قوم آپ کو وطن سے نکال دے گی۔'' حضور نے پوچھا ''کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟'' ورقہ نے کہا ''ہاں جو کچھ آپ پر نازل ہوا ہے جب کسی پر نازل ہوتا ہے تو دنیا اس کی مخالف ہو جاتی ہے۔اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو آپؐ کی بھرپور مدد کروں گا۔''

کچھ مدت کے بعد ورقہ کا انتقال ہو گیا۔ حضرت خدیجہ کو یقین ہو گیا کہ حضورؐ منصب رسالت پر فائز ہو چکے ہیں۔ چنانچہ وہ بلا تامل حضورؐ پر ایمان لے آئیں۔ تبلیغ کا کام شروع ہو گیا۔ حضورؐ کو ایک مومنہ مل گئی۔ سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہونے والی ایک خاتون تھیں جس کا نام خدیجۃ الکبریٰؓ ہے۔

نبوت کے بعد حضرت خدیجہؓ سال زندہ رہیں۔ یہ پر آشوب زمانہ تھا۔ اس مدت میں آپ نے صدہا صعوبتیں سہیں۔ مصائب کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ حضورؐ کا ہر لمحہ، ہر آن، ہر حال ساتھ دیتی رہیں۔ رفاقت و جان نثاری کی مثال قائم کر دی۔ تبلیغ حق میں حضورؐ کا دست و بازو ثابت ہوئیں۔ اپنا تمام مال و زر اسلام پر نثار کر دیا۔ اپنی ساری دولت یتیموں، بیسیروں، بے کسوں، لاچاروں، ناداروں کی حاجت روائی میں لگا دیں۔ حضورؐ کفار کی بیہودگی و شرارت و مظالم پر کبھی کبھی کبیدہ خاطر ہوتے تو حضرت خدیجہ عرض کرتیں ''یا رسول اللہ! آپ رنجیدہ نہ ہوں۔ بھلا کوئی ایسا رسول بھی آج تک آیا ہے جس سے لوگوں نے تمسخر نہ کیا ہو۔'' اس تسلی سے حضورؐ کو تسکین ہو جاتی تھی۔ حضورؐ فرمایا کرتے تھے ''میں جب کفار سے کوئی بات سنتا تھا اور وہ مجھ کو ناگوار معلوم ہوتی تھی تو میں خدیجہؓ سے کہتا۔ وہ اس طرح میری ڈھارس بندھاتی تھیں کہ میرے دل کو تسکین ہو جاتی تھی اور کوئی رنج ایسا نہ تھا جو خدیجہ کی باتوں سے آسان اور ہلکا نہ ہو جاتا تھا۔''

حضرت بی بی خدیجہؓ کے بطن سے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو چھ لڑکے لڑکیاں دیں۔ سب سے پہلے قاسم پیدا ہوئے جو کمسنی میں ہی انتقال کر گئے۔ پھر زینب، ان کے بعد عبداللہ، وہ بھی صغر سنی میں ہی انتقال کر گئے۔ پھر رقیہ، پھر ام کلثوم اور پھر فاطمۃ الزہرا پیدا ہوئیں۔

نبوت کے ساتویں سال میں مشرکین قریش نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ بنو ہاشم اور بنو مطلب کو شعب ابی طالب میں محصور کر دیا۔ حضرت خدیجہ بھی اس مصیبت میں حضورؐ کے ساتھ تھیں۔ وہ پورے تین برس تک اس محصوری کے روح فرسا آلام و مصائب بڑے صبر و استقلال کے ساتھ جھیلتی رہیں۔ تمام قبائل نے ایک معاہدہ مرتب کیا کہ کوئی شخص نہ خاندان بنو ہاشم سے قربت کرے گا نہ ان کے ہاتھ خرید و فروخت کرے گا، نہ ان سے ملے گا، نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا، جب تک وہ حضور کو قتل کر کے حوالے نہ کر دیں۔ یہ معاہدہ کعبہ کے دروازے پر آویزاں کر دیا گیا۔ یہ زمانہ ایسا سخت گزرا کہ لوگ پتے کھا کھا کر رہتے تھے۔ حضرت سعد بن وقاص کا بیان ہے کہ میں نے ایک سوکھا چھڑا پانی سے دھویا، پھر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔ بچے بھوک سے روتے تھے اور قریش سن سن کر خوش ہوتے تھے۔ ایک دن حضرت خدیجہؓ کا بھتیجا تھوڑے سے گیہوں حضرت خدیجہؓ کے پاس بھیجا۔ راہ میں ابوجہل نے دیکھ لیا اور چھین لینا چاہا۔ اتفاق سے ایک اور کافر کو رحم آ گیا اور چھیننے سے منع کر دیا۔ نبوت کے دسویں سال میں یہ ظالمانہ محاصرہ ختم ہوا۔ لیکن اس کے بعد حضرت خدیجہ زیادہ دن زندہ نہ رہیں۔ اسی سال رمضان المبارک میں ان کی طبیعت ناساز ہوئی۔

حضورؐ نے معالجہ اور تسکین و تشفی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ لیکن اجل کا پیغام آ ہی گیا۔ 11 / رمضان المبارک ۱۰ نبوی کو انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا اور مکہ کے قبرستان حجون میں دفن ہوئیں۔ اس وقت ان کی عمر ۶۵ / سال تھی۔ پچیس سال حضورؐ کے ساتھ ازدواجی زندگی بسر کی۔ آپ کی وفات سے چند ہی روز قبل حضورؐ کے چچا ابوطالب کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ اب آپ کے مددگار اور غم گسار دونوں اٹھ گئے۔ یہ اسلام کا سخت ترین زمانہ تھا۔ کفار کا ظلم شباب پر تھا۔ حضور اس سال کو سال غم (عام الحزن) فرمایا کرتے تھے۔

حضور کو حضرت خدیجہؓ سے بے انتہا محبت تھی۔ ان کی وفات کا آپؐ کو بے پناہ صدمہ ہوا اور آپ اکثر ملول رہنے لگے۔ وفات کے بعد بھی آپؐ کو ان سے اتنی محبت تھی کہ جب کوئی قربانی کرتے تو پہلے حضرت خدیجہ کی سہیلیوں کو گوشت بھیجتے اور بعد میں کسی اور کو دیتے۔ حضرت خدیجہؓ کا کوئی رشتہ دار جب کبھی آپ کے پاس آتا تو آپ اس کی بے حد خاطر و مدارات فرمایا کرتے۔ رحلت خدیجہ الکبری کے بعد موت تک حضور اس وقت تک گھر سے باہر تشریف نہ لے جاتے جب تک حضرت خدیجہ کی اچھی طرح تعریف نہ کر لیتے۔ اسی طرح جب گھر تشریف لاتے تو ان کا ذکر کر کے ان کی خوبیاں یاد فرماتے تھے۔

حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ گو میں نے خدیجہؓ کو نہیں دیکھا لیکن مجھے جس قدر ان پر رشک آتا تھا کسی اور پر نہیں آتا تھا۔ ایک دفعہ انتقال کے بعد حضرت خدیجہ کی بہن ہالہ حضورؐ سے ملنے آئیں اور قاعدہ کے مطابق اندر آنے کی اجازت مانگی۔ ان کی آواز حضرت خدیجہؓ کی آواز سے ملتی تھی۔ آپؐ کے کانوں میں آواز پڑی تو آپؐ کو حضرت خدیجہؓ یاد آ گئیں اور آپؐ بے جھجک اٹھے اور فرمایا کہ ''ہالہ'' ہوں گی۔ حضرت عائشہؓ بھی موجود تھیں۔ ان کو رشک ہوا۔ بولیں کہ آپ ایک بڑھیا کو یاد کرتے ہیں۔ جو مر چکیں اور خدا نے آپ کو ان سے اچھی بیویاں دیں۔ حضورؐ کا روئے مبارک سرخ ہو گیا۔ آپؐ نے حضرت خدیجہؓ کی خدمات کا تفصیلی ذکر شروع فرما دیا۔ حضورؐ نے حضرت خدیجہؓ کی وفات تک کوئی شادی نہیں کی۔ جس گھر میں حضرت خدیجہؓ رہتی تھیں امیر معاویہ نے اس کو خرید کر مسجد بنا دیا اور آج بھی وہ وہی نام سے موسوم ہے۔

غرض ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبری طاہرہ اسلام کی مقبول ترین خاتون ہیں۔ ان کا مقام اس بات سے واضح ہے کہ اللہ پاک نے خود انہیں سلام بھیجا تھا اور جبرئیل امین نے سلام کہا تھا۔ امہات المومنین میں سب سے طویل مدت، پچیس سال کا عرصہ حضورؐ کی خدمت کرنے کا شرف صرف انہیں کو حاصل ہے۔ یہ مکہ کا وہ دور تھا جبکہ ظہور اسلام سے قبل حضورؐ قریش مکہ کے لئے انسان کامل، پیکر حسن اخلاق و قائد بے مثال تھے۔ مگر ظہور اسلام کے فوراً بعد انہیں لوگوں کے لئے آپؐ آفت غیبی و دشمن طرز زندگی بن گئے۔ ایسے دَور میں جبکہ حضورؐ رحمت عالم بننے کے مرحلوں سے گذر رہے تھے اور پھر نبوت کے بعد رحمت عالم بن چکے تھے حضرت بی بی خدیجہؓ حضورؐ کی رفاقت میں جسم و جان کی طرح لگی رہیں۔ یہ سعادت کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ پہلی وحی کے موقع پر جب حضورؐ خود گھبرا گئے تھے آپؐ کو تسلی و تشفی دینے والی واحد ہستی حضرت خدیجہ کی ذات اقدس تھی۔ یہاں یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ خود مالک ایک خاتون کے ذریعہ اپنے محبوب کی ڈھارس بندھا رہا ہے۔ غور کیجئے اس خاتون کا کیا مقام ہوگا جس سے مالک خود یہ کام لے!

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اس بُرج کا دُرِ مکنون

علامہ اقبالؔ

ڈاکٹر فوزیہ چودری

م۔ن۔سعید

ایک بانکا سجیلا، سانولا معمر نوجوان محفل میں مسکراہٹ بکھیرتے آتا ہے تو حاضرین محفل، جوان ہوں کہ بوڑھے، اس کے استقبال کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب وہ شہ نشین پر اپنی جگہ لیتا ہے تو چہرے سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ وہ بات بھی کر سکتا ہے کہ نہیں۔ مگر تقریر کی باری آئے گی تو وہ معتدل انداز میں سامعین پر ایک درد کا فوارہ بن کر ابل پڑے گا اور اس کے درد کا رشتہ اردو اور اردو والوں کی بقا سے منسلک ہوگا۔

رام نگر کے متوطن، ریشم کے کاروباری محترم عبدالکریم اور ان کی اہلیہ صغیر النساء نے اپنے لڑکے کا اچھا خاصا نام ''محمد نورالدین سعید'' رکھا تھا۔ انھیں کیا پتہ تھا کہ لڑکا اپنی مرضی سے نام کو توڑ پھوڑ کر تین حصوں میں بانٹ دے گا اور ''م۔ن۔سعید'' کہلائے گا۔

م۔ن۔سعید کی والدہ لاہور کی فارغ التحصیل، شعر و ادب کا ذوق رکھنے والی، عروض کی ماہر خاتون تھیں، جن کے دم سے گھر کی ادبی فضا مترنم تھی۔ ''غزلیاتِ غالب کا عروضی تجزیہ'' جیسی ان کی اہم کتاب دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ اس طرح سعید صاحب کو ادبی ماحول ورثہ میں ملا۔

انہوں نے میسور یونیورسٹی سے اردو میں۔اے۔کیا۔ ''حضرت خواجہ بندہ نواز سے منسوب دکنی رسائل'' کے موضوع پر ۱۹۸۲ء میں پروفیسر محمد حنیف کلیم کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کی تکمیل کی۔ یم۔اے۔اردو میں داخلے سے قبل روزنامہ سالار کے ادبی صفحے کے مدیر رہے۔ ان دنوں ''کرناٹک اردو یوتھ فیڈریشن'' کا قیام عمل میں آیا۔ عزیز اللہ بیگ، عسکر رضا واسطی، عبدالحفیظ اور م۔ن۔سعید اس کے روح رواں تھے۔ فیڈریشن کی جانب سے ''ہماری زبان'' کے نہج پر پندرہ روزہ اخبار ''مضراب'' شائع ہوا۔ اور بعد کو یہی ''لوح و قلم'' کے نام سے جاری ہوا۔ مختلف سمیناروں، محفلوں و مقابلوں کا انعقاد فیڈریشن کے لائحہ عمل میں شامل تھا۔ ان سرگرمیوں کی وجہ سے بنگلور کے اردو طلبہ کو ایک پلیٹ فارم سے جڑنے اور اپنے مسائل کے متعلق سوچنے کا موقع ملا۔ اس انجمن نے بنگلور یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے قیام کی جانب حکومت کو متوجہ کیا۔ بنگلور یونیورسٹی میں بالآخر شعبہ اردو کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۸۰ء میں م۔ن۔سعید بحیثیت اردو لیکچرر جامعہ بنگلور سے منسلک ہوئے۔ ۱۹۹۲ء میں اس شعبے کے صدر بنے اور مارچ ۲۰۰۴ء تک صدر شعبہ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ دوران صدارت شعبے نے کافی ترقی کی۔ ہندوستان کا ایک باوقار اردو شعبہ بنا۔ ان ہی کی سعی جمیلہ سے شعبہ اردو میں مراسلاتی اردو یم۔اے۔کورس کا آغاز ہوا۔

ترقی اردو بورڈ کی سابقہ چیر پرسن ڈاکٹر فہمیدہ بیگم ریسرچ کے لیے لندن گئیں تو اپنے بھائی م۔ن۔سعید کے لیے ٹائپ رائٹر کا تحفہ لائیں۔ م۔ن۔سعید نے اس تحفے کو اردو فیڈریشن کے لیے وقف کر دیا تھا۔ مجھ سے عزیز اللہ بیگ نے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ م۔ن۔سعید کی اردو چاہت اور فیڈریشن سے انسیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ م۔ن۔سعید مصمم ارادے کے مالک، خود مختار، خود اعتماد

اور خود مستبد ہونے کے ساتھ ساتھ مجسم خلوص اور نرم خو ہیں۔ وہ متضاد صفات کا نادر شاہکار ہیں۔

آج جب کہ فضا اردو کے لیے سازگار نہیں ہے۔ اردو کے نام نہاد خیر خواہوں و ہمدردوں کا ایک سیلاب ہے جو بڑھا چلا آ رہا ہے مگر اردو کے سچے چاہنے والوں کا ایک طرح سے فقدان ہے۔ ایسے میں پروفیسر م۔ن۔ سعید کی شخصیت چراغ راہ کی مانند ہے۔ وہ کبھی اردو کی ڈوبتی دنیا کی فکر میں غلطاں نظر آئیں گے تو کبھی کسی شاگرد عزیز کے لیے فکر مند ہوں گے۔ اردو کے لیے کبھی سرکار سے تو کبھی اردو والوں سے ہی شکوہ کریں گے۔ بنیادی طور پر اردو والوں کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے کی ایک لگن ان میں موجود ہے۔ ع

''ایک ہنگامے پے موقوف ہے گھر کی رونق''

پروفیسر م۔ن۔ سعید اداکار، صداکار، افسانہ نگار، محقق اور نقاد ہیں۔ وہ اور بھی کچھ ہو سکتے ہیں مگر پروفیسر نہیں۔ میری نظر میں پروفیسر ہونے کے لیے پروفیسر لگنا بھی ضروری ہے۔ پروفیسروں کی خامیوں کی طرف اشارہ کرنا بھی ایک خامی ہے مگر خاکم بدہن ان میں پروفیسروں جیسی کوئی خوبی نہیں ہے۔ پروفیسر غائب دماغ، نسیان کا مریض، متعصب، جانب دار، علاقائیت پسند، جا بے جا شاگردوں پر رعب جمانے والا اور جس کا حلیہ بھی مخصوص ہوتا ہے۔ ان مذکور خصوصیات سے جو شخص متصف نہ ہو وہ کیسے پروفیسر ہو سکتا ہے؟ نہ کبھی انھوں نے اعزازات وانعامات کا پیچھا کیا اور نہ کبھی اخباروں کی سرخیوں کے لیے دوڑ لگائی۔ ان ''خوبیوں'' کے بغیر ایک م۔ن۔ سعید ہی کیا کوئی بھی شخص اردو کا پروفیسر نہیں ہو سکتا! ہاں پروفیسر م۔ن۔ سعید میں دو ایک خوبیاں پروفیسروں والی ہم نے ضرور دیکھی ہیں۔ وہ ہمیشہ جلسوں میں تاخیر سے پہنچتے ہیں۔ اب دیر سے نہ آئیں تو بھلا کیا کریں؟ اردو کے جلسے کب وقت پر شروع ہوتے ہیں۔ وقت پر شروع بھی ہوں تو بسا اوقات گروہی ناچاقی اور باہمی چشمک کی نذر ہو جاتے ہیں۔ پروفیسر م۔ن۔ سعید ٹھہرے اعتدال پسند، نرم مزاج اور مسکراہٹوں والے آدمی۔ اگر نوبت ہاتھا پائی تک بھی پہنچ جائے تو موصوف دور کھڑے اپنی مسکراہٹیں بکھیرتے رہیں گے۔ لڑنا بھی ایک ہنر ہے، یہ ہنر ان کے بس کا نہیں ہے۔ اس طرح کی محفلوں کے بعد مزید گفت وشنید کے خوف سے وہ اپنا موبائل فون آف رکھتے ہیں۔ ویسے اکثر ان کا فون بند ہی رہتا ہے۔ حفظ ماتقدم اس کو کہتے ہیں۔ مطلب سمجھ میں نہ آئے تو فون سے رابطہ قائم کر کے تجربہ کر لیں۔

پروفیسر م۔ن۔ سعید ایک مجلسی آدمی ہیں۔ یہاں لفظ ''مجلسی'' ان معنوں میں استعمال ہوا ہے جن معنوں میں ''مجلسی'' استعمال ہوتا ہے۔ وہ محفلوں میں جنٹل من کی طرح آتے ہیں۔ دروغ بہ گردن راوی کہ وہ ''آئینہ بیوٹی پارلر'' سے سج سنور کر آتے ہیں۔ موقع محل کے اعتبار سے لباس پہننے کے ہنر سے خوب واقف ہیں۔

اردو والے مسکین صورت اور پریشان حلیہ لیے ادبی محفلوں میں داخل ہوتے ہیں، مگر پروفیسر سعید اردو کے وقار کو اپنے کردار سے ہی نہیں، اپنی وضع قطع، رکھ رکھاؤ، خوش لباسی اور برتاؤ سے بھی باقی رکھنے کی ممکن کوشش کرتے ہیں۔ انھیں شاید یہ گوارا نہیں کہ ہماری دوسری زبانوں سے کسی معاملے میں پیچھے رہ جائے۔

میرے شوہر پروفیسر سعید کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ آج بھی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ گفتگو میں استاد کی شان کے خلاف ہلکی سی چوٹ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ میرے شوہر کی طرح ان کے عقیدت مند شاگرد، شہر گلستان بنگلور اور اس کے باہر سینکڑوں کی تعداد میں پھیلے

ہوئے ہیں۔ان کے یہ ارادت مند ہر جگہ اپنے استاد کے گن گاتے نظر آئیں گے۔لکھنو میں انیسیئے اور دبیریے تھے۔بنگلور میں سعیدیوں کا بول بالا ہے۔

پروفیسرم۔ن۔سعید کی شخصیت سیدھی سادھی نہیں ہے بلکہ پرت در پرت ہے۔وہ کھلی کتاب کی مانند کبھی خود کو ظاہر نہیں کرتے۔ ایسی ہمہ گیر شخصیت کا ایک رخ سے مطالعہ کرنا بہت مشکل ہے۔انہوں نے الگ الگ موقعوں پر نت نئے زاویوں سے لوگوں کو چونکایا ہے۔

وہ بت گر ہیں اور بت شکن نہیں ..... بت گر، یوں کہ خود کو بت کی طرح تراشا ہے،

اتنا تراشا ہے کہ وہ پروفیسر کم اور انسان زیادہ لگتے ہیں۔بت شکن اس لیے نہیں ہیں کہ ان کی خندہ پیشانی پر کبھی کوئی شکن ہم نے نہیں دیکھی ہے۔

وہ غزلیں پڑھتے ہیں، پڑھاتے ہیں اور غزل گائیکی کی محفلوں میں گلوکاروں کی ہمت افزائی کے لیے داد دیتے بھی نظر آتے ہیں مگر غزلوں سے دور رہتے ہیں۔دور رہنے کی بات یوں بھی سچ ہے کہ ان کے ''اقبال'' کی صف میں کسی اور 'نساء' کا اضافہ نہیں ہوا، ورنہ وہ بھی مغنی تبسم اور شہریار کی طرح ''غزلیں'' ڈھونڈتے، لکھتے اور سناتے ہوتے!

انھیں افسانوں کا جنون ہے۔تمام افسانہ نگاروں کو پڑھا، دیکھا اور برتا بھی ہے۔وہ لوگوں کے معیار کے مطابق بات کرتے ہیں۔ اکثر خول میں بند رہتے ہیں۔کھل کر بات کرنے کا نہ جتن کرتے ہیں اور نہ ضروری سمجھتے ہیں۔مگر کیا دوست کیا دشمن سبھی سے رواداری سے ملتے ہیں۔چہرے سے ہمیشہ مسکان و مٹھاس ٹپکتی رہتی ہے۔اسقدر مٹھاس کو لٹاتے ہم نے بہت کم لوگوں کو دیکھا ہے۔ادبی محفلوں میں اس طرح مٹھاس بنتی رہی تو اردو والے شوگر کے مریض ہو جائیں گے۔

پروفیسرم۔ن۔سعید کمپیوٹرس میں اچھی استعداد رکھتے ہیں۔صحافت سے تعلق رہا ہے۔دکنی زبان سے لگاؤ ہے۔بی ایس سی کے بعد اردو دنیا میں داخل ہوئے ہیں۔خاصے سائنٹفک رجحان کے مالک ہیں۔مینارٹی کوچنگ سنٹر کے ڈائرکٹر ہیں۔انھیں سروجنی نائیڈو ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔

تعلیم بالغان کے سلسلے میں بنگلور کے دور دراز علاقوں میں جانا، چھوٹے بچوں کو اردو پڑھانے کے لیے وقت نکالنا کوئی آسان کام نہیں ہے مگر پروفیسرم۔ن۔سعید یہ کام بھی آسانی سے کر گزرتے ہیں۔اردو پڑھانے کے لیے گندی بستیوں میں پہنچ کر بچوں کو گود میں اٹھانا، پیار سے رجھانا، واقعی ایک درد کا رشتہ ہے جسے اردو کی محبت کہتے ہیں۔

موصوف کس نگری کے ہیں؟ کس چھب سے زندگی جیتے ہیں؟ اوائل عمری میں کیا کرتے رہے؟ اوامر و نواہی کی پابندی کس حد تک ہوتی ہے؟ ان سب باتوں سے غرض کس روسیاہ کو ہے؟ مجھے تو اس شخصیت کی نقاب کشائی کرنا ہے جو پہلے ہی سب کے سامنے بے نقاب ہے۔

پروفیسر سعید پر خاکہ لکھنے سے قبل مواد اکٹھا کرنے کی غرض سے کئی لوگوں سے ملی۔بعض احباب نے اتنی عقیدت کا اظہار کیا کہ ذہن میں ان کی باتوں کو رکھ کر خاکہ لکھنا چاہوں تو پروفیسر سعید کے نام کے ساتھ قبلہ و کعبہ کا لاحقہ چسپاں کرنا، سبحان اللہ و الحمد للہ کا طغرا بنانا

پڑے گا۔اس دوران کئی دل جلے بھی ملے۔ان میں سے ایک نے منہ بگاڑ کر کہا.....''اجی وہ پروفیسر سعید، ادب میں غالبؔ کے بعد خود کو غالب سمجھتا ہے''۔میں نے سوچا، کیوں نہ ہو؟ غالبیات میں درک ہے، لوریوں کی جگہ غالب کی غزلیں سنی ہیں۔برسوں غالب کو پڑھا اور پڑھایا ہے۔مطالعہ غالب کے اتنے اثرات بھی نہ ہوں تو وہ غالب کی شاعری نہ ہوئی کوئی تک بندی ہوئی .....اجی غالب کے شعری مطالعے کے کچھ تو اثرات ہونے چاہئیں، ورنہ غالبؔ کیسے غالب کہلائے گا؟

غالب وسیع النظر شاعر تھا۔اس کے نام کا استعمال بھی وسیع المشربی سے ہو تو بہتر ہے۔یوں تنگ نظری ادب میں آتی رہے تو دوسرا غالب کیسے پیدا ہوگا؟ ہم میں ہر ایک نہ سہی چند ایک تو خود کو غالبؔ سمجھیں۔خود کو غالب سمجھنے کے لیے بھی محنت، لگن اور جرات درکار ہوتی ہے۔اس طرح بہت سارے اردو والے خود کو بیک وقت غالب سمجھنے لگیں گے تب کہیں دوسرے غالب کے پیدا ہونے کا امکان قوی ہوگا۔ ادب برائے ادب کا مطالعہ کر کے اردو والے اعتراض برائے اعتراض کے لاعلاج مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں۔انھیں ادب برائے زندگی کی دوا لینی چاہیے۔جناب والا پروفیسر م۔ن۔سعید صاحب ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔آپ غالب پڑھیں، غالب پڑھائیں، غالب کھائیں، غالب اوڑھیں، غالب بچھائیں اور غالب سوئیں مگر شرط یہ ہے کہ ایک غالب ضرور بنائیں۔

مختلف النوع کام کے ذریعہ آمدنی کے وسائل میں اضافہ بری بات نہیں، اچھی بات ہے۔اردو والے صرف اردو کی روکھی سوکھی روٹی پر قانع ہو جائیں تو اس میں پروفیسر م۔ن۔سعید کا کیا قصور ہے؟ معترضین بھی اگر خوش حال زندگی کے خواہاں ہوں تو انھیں چاہیے کہ پروفیسر سعید کے نقش قدم پر چلیں۔

پروفیسر م۔ن۔سعید اپنی ذات میں ایک ادارہ ہیں۔ایک اچھے منتظم اور مدبر بھی۔فعال و چست ایسے کہ گھنٹوں محفلوں میں بیٹھے رہنے کے باوجود کسی طرح کی سستی و تھکن کا اظہار نہیں کریں گے۔حس مزاح کافی تیز ہے۔شستہ مزاح، ان کی شخصیت میں اور جاذبیت پیدا کر دیتا ہے۔اچھے روابط ہیں۔اثر بھی ہے اور رسوخ بھی۔نیز اثر و رسوخ پر یقین بھی! ان کی موافقت کے ساتھ ساتھ مخالفت بھی ہوتی ہے لیکن کٹر سے کٹر مخالف بھی ان کی مسکان اور رواداری کا قائل ہے بلکہ گھائل بھی! متقابل میں صلاحیت نہ ہو تو وہ گھاس بھی نہیں ڈالتے۔ہاں صلاحیت ہو تو جلا دینے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔

''دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر''۔

محمد رفیع سوداؔ

قصیدہ در نعت

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زُنّارِ تسبیحِ سلیمانی

ہُنر پیدا کر اول، ترک کیجو تب لباس اپنا
نہ ہو جوں تیغ بے جوہر، وگرنہ ننگ عریانی

فراہم زر کا کرنا باعثِ اندوہِ دل ہووے
نہیں کچھ جمع سے غنچے کو حاصل، جز پریشانی

خوشامد کب کریں عالی طبیعت اہلِ دولت کی؟
نہ جھاڑے آستینِ کہکشاں، شاہوں کی پیشانی

عروجِ دستِ ہمت کو نہیں ہے قدر بیش و کم (۵)
سدا خورشید کی جگ پر مساوی ہے زر افشانی

کرے ہے کلفتِ ایام ضائع قدر مردوں کی
ہوئی جب تیغ زنگ آلود، کم جاتی ہے پہچانی

اکیلا ہو کے رہ دنیا میں، چاہے گر بہت جینا
ہوئی ہے فیضِ تنہائی سے، عمرِ خضر طولانی

اذیت وصل میں دونی، جدائی سے ہو عاشق کو
بہت رہتا ہے نالاں، فصلِ گل میں، مرغِ بستانی

موقر جان اربابِ ہنر کو، بے لباسی میں
کہ ہو جو تیغ با جوہر، اسے عزت ہے عریانی

بہ رنگِ کوہ رہ خاموش، حرفِ ناسزا سن کر (۱۰)
کہ تا بد گو، صدائے غیب سے کھینچے پشیمانی

نہیں غیر از ہوا کوئی ترقی بخش آتش کا
نفس جب تک ہے، داغِ دل سے، فرصت کیوں کرے پانی

یہ روشن ہے بہ رنگِ شمع ربطِ یاد و آتش سے
موافق گر نہ ہووے دوست ہے وہ دشمنِ جانی

کرے ہے دہر زینت ظالموں پر تیرہ روزی کو
کہ زیبِ ترکِ چشمِ یار سرمہ ہے صفاہائی

طلوعِ مہر ہو پامال حیرت آسماں اوپر
لکھوں بہرِ غزل گر اس زمیں میں مطلعِ ثانی

مطلعِ ثانی

عجب ناداں ہیں وہ، جن کو ہے عجب تاجِ سلطانی (۱۵)
فلک، بالِ ہما کو، پل میں سونپے ہے مگس رانی

نہیں معلوم، ان نے خاک میں کیا کیا ملا دیکھا؟
کہ چشمِ نقشِ پا سے تا عدم، نکلی نہ حیرانی

ہماری آہ، دلِ تیرا نہ نرما دے، تو یا قسمت!
وگرنہ دیکھ آئینہ، کہ پتھر ہو گئے پانی

تری زلفوں سے اپنی روسیاہی کہہ نہیں سکتا
کہ ہے جمعیت خاطر مجھے، ان کی پریشانی

زمانے میں نہیں کھلتا ہے کارِ بستہ، حیراں ہوں
گرہ غنچوں کی کھولے ہے صبا، کیوں کر بہ آسانی

جنوں کے ہاتھ سے، سرتا قدم کاہیدہ اتنا ہوں (۲۰)
کہ اعضا، دیدہ زنجیر کی کرتے ہیں مژگانی

نہ رکھا جگ میں رسم دوستی، اندوہ روزی نے
مگر زانو سے اب باقی رہا ہے، ربطِ پیشانی

سیہ بختی میں، اے سوداؔ! نہیں طولِ سخن لازم
نمط خامے کے، سر کٹوائے گی ایسی زباں دانی

سمجھ اے ناقباحت فہم! کب تک یہ بیاں ہوگا
ادائے چین پیشانی ولطف زلف طولانی

خدا کے واسطے باز آ تو، اب ملنے سے خوباں کے
نہیں ہے ان سے ہرگز فائدہ غیر از پشیمانی

نظر رکھنے سے حاصل ان کی چشم وزلف کے اوپر (۲۵)
مگر بیمار ہووے صعب، یا کھینچے پریشانی

نکال اس کفر کو دل سے، کہ اب وہ وقت آیا ہے
برہمن کو صنم کرتا ہے، تکلیفِ مسلمانی

زہے دینِ محمدؐ! پیروی میں اس کی جو ہوویں
زہے! خاکِ قدم سے اُن کی چشم عرش نورانی

ملک سجدہ نہ کرتے آدم خاکی کو، گر اس کی
امانت دارِ نورِ احمدی، ہوتی نہ پیشانی

اسی کو آدم وحوا کی خلقت سے کیا پیدا
مراد الفاظ سے معنی ہے تا آیات قرآنی

خیالِ خلق گر اس کا، گر شفیعِ کافراں ہووے (۳۰)
رکھیں بخشش کے سرِ منت، یہودی اور نصرانی

زباں پر اس کی گزرے حرف جس جا گہ شفاعت کا
کرے واں ناز آمرزش پہ ہر یک فاسق وزانی

رکھا جب سے قدم مسند پہ آ، ان نے شریعت کی
کرے ہے موجِ بحرِ معدلت تب سے یہ طغیانی

اگر نقصان پر جس کے شرر کا ٹک ارادہ ہو
کُرے کو آگ کے دو ہیں کرے غرق آن کر پانی

موافق گر نہ کرتا عدل اس کا آب وآتش کو
تو کوئی سنگ سے بندھتی تھی شکل لعل رمّانی

یہ کیا انصاف ہے یارب کہ طیر ووحش تک جگ میں
اس امن وعیش سے اپنی بسر اوقات لے جانی

پلے ہے آشیاں میں باز کے، بچہ کبوتر کا
شباں نے گُرگ کو، گلے کی سونپی ہے نگہ بانی

ہما آسا ہے پرداز بلخ اوج سعادت پر
کرے ہے مور چڑھ کر سینۂ دد پر سلیمانی

کھلے ہیں غنچہ گل باغ میں خاطر سے بلبل کی
جو، اب اوراق جمعیت کو ہوتی ہے پریشانی

جہاں انصاف سے ہر گاہ اب معمور ہے اتنا
تو اس کے آگے ہوگی عدل کی کیا کچھ فراوانی

ہزار افسوس اے دل ہم نہ تھے اس وقت دنیا میں
وگرنہ کرتے یہ آنکھیں جمال اس کے سے نورانی

نہ ہونے سے جدا سایے کے اس قامت سے پیدا ہے
قیامت ہوئے گا دلچسپ، وہ محبوبِ سبحانی

جسے یہ صورت وسیرت، کرامت حق نے کی ہووے
بجا ہے، کہیے ایسے کو، اگر اب یوسفِ ثانی

معاذ اللہ! یہ کیا لفظ بے موقع ہوا سرزد
جو اس کو پھر کہوں تو ہوؤں مردود مسلمانی

کدھر اب فہم ناقص لے گیا مجھ کو نہ یہ سمجھا
کہ وہ مہرِ اُلوہیت ہے، یہ ہے، ماہِ کنعانی

جوصورت اس کی ہے لا ریب ہے وہ صورت ایزد جو معنی اس میں ہیں، بے شک وہ ہیں معنی ربانی
حدیثِ مَن رآنی، دال ہے اس گفتگو، اوپر کہ دیکھا جن نے اس کو ان نے دیکھی شکل یزدانی
غرض، مشکل ہمیں ہوتی کہ پیدا کر کے ایسے کو خدا، گر یہ نہ فرماتا نہیں کوئی مرا ثانی
بس آگے مت چل اے سوداؔ! میں دیکھا فہم کو تیرے
کر استغفار اب، اس منہ سے، ویسے کی ثنا خوانی

شہر آشوب

از: محمد رفیع سودا

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں تو ڈانواڈول　　پھرے ہے جا کہیں نوکر ہو لے کے گھوڑا مول
لگا وہ کہنے کہ اس کے جواب میں دو بول　　اگر کہوں میں تو سمجھے گا تو کہ ہے یہ ٹھٹھول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیروں یا تول

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند　　سو آمدان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند　　جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداریٔ گول

پس ان کا ملک میں کارنسق جو یوں ہو تباہ　　کہ کوہ زر ہو زراعت میں تو نہ دیں پرکاہ
جگہ وہ کونسی نوکر رکھیں یہ جس پہ سپاہ　　کہاں سے آئیں پیارے کریں جو پیش نگاہ
کدھر سوار جو پیچھے چلیں وہ باندھ کے غول

جو کوئی ملنے کو ان کے انھوں کے گھر آیا　　ملے یہ اس سے گرا پنا دماغ خوش پایا
جو ذکر سلطنت اس میں وہ درمیاں آیا　　انھوں نے پھیر کے ادھر سے منہ یہ فرمایا
خدا کے واسطے بابا کچھ اور باتیں بول

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ سے　　کہ جس کے دیکھے سے جاتی رہے تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھوں تو دل ہوئے زندگی سے اداس　　بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں ڈہے مرغول

رکھے تھی سیر یہ پنگھٹ کے گرد کے دیہات　　کہ لب جہاں کے تھے پنہاریوں کے آب حیات
اور ان درختوں کے دے چھاؤں دے گھنے گھنے بات　　نہ وے درخت ہیں واں اب نہ آدمی کی ذات
کنوؤں میں مردے پڑے ہیں نہ ریسمان ہے نہ ڈول

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم　　نہ جانے کن رکھایاں قدم وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سرو و صنوبر ہے اس جگہ میں زقوم　　مچی ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم
گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھیں کلول

جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا　　مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقش باطل تھا　　عجب طرح کا یہ بحر جہاں پہ ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

دیا بھی وہاں نہیں روشن تھے جس جگہ فانوس　　پرے ہیں کھنڈروں میں آئینہ خانوں کے مانوس
کڑوڑ دل پر از امید ہو گیا مایوس　　گھروں سے یوں نجبا کی نکل گئی ناموس
ملی نہ ڈولی انہیں تھے جو صاحب چنڈول

غرض میں کیا کہوں یارو کہ دیکھ کر یہ قہر　　کروڑ مرتبہ خاطر میں گزرے ہے یوں لہر
جو ٹک ہے امن دل اپنے کو دیوے گردش دہر　　تو بیٹھ کر کہیں یہ روئیے کہ مردم شہر
گھروں سے پانی کو باہر کریں جھکول جھکول

بس اب خموش ہو سوداؔ کہ آگے تاب نہیں　　وہ دل نہیں ہے کہ اس غم سے جو کباب نہیں
کسی کی چشم نہ ہوگی کہ وہ پر آب نہیں　　سوائے اس کے تری بات کا جواب نہیں
کہ یہ زمانہ ہے بے طرح کا زیادہ نہ بول

میر انیسؔ

مرثیہ

فرزند پیمبر کا، مدینے سے سفر ہے　　سادات کی بستی کے، اُجڑنے کی خبر ہے
درپیش ہے وہ غم، کہ جہاں زیروزبر ہے　　گل چاک گریباں ہیں، صبا خاک بہ سر ہے
گل روصفتِ غنچہ، کمر بستہ کھڑے ہیں
سب ایک جگہ صورتِ گلدستہ کھڑے ہیں

آراستہ ہیں بہر سفر مردِ قبا پوش　　عمامے سروں پر ہیں، عبائیں بہ سر دوش
یارانِ وطن ہوتے ہیں آپس میں ہم آغوش　　حیراں کوئی تصویر کی صورت، کوئی خاموش
منہ ملتا ہے رو کر کوئی سرور کے قدم پر
گر پڑتا ہے کوئی علی اکبر کے قدم پر

عباسؔ کا منہ دیکھ کے کہتا ہے کوئی آہ!　　اب آنکھوں سے چھپ جائے گی تصویر یداللہ
کہتے ہیں گلے مل کے یہ قاسم کے ہواخواہ　　واللہ دلوں پر ہے عجب صدمۂ جاں کاہ
ہم لوگوں سے شیریں سخنی کون کرے گا
یہ انس، یہ خُلقِ حسنی کون کرے گا

روتے ہیں وہ، جو عون محمد کے ہیں، ہم سن　　کہتے ہیں کہ مکتب میں نہ جی بہلے گا تم بن
اس داغ سے چین آئے ہمیں، یہ نہیں ممکن　　گرمی کا مہینا ہے، سفر کے یہ نہیں دن
تم حضرتِ شبّیرؔ کے سایے میں پلے ہو
کیوں دھوپ کی تکلیف اٹھانے کو چلے ہو

ہم جولیوں سے کہتے تھے وہ دونوں برادر　　ہاں بھائیو، تم بھی ہمیں یاد آؤ گے اکثر
پالا ہے ہمیں شاہ نے، ہم جائیں نہ کیوں کر　　ماموں رہیں جنگل میں تو اپنا ہے وہی گھر
وہ دن ہو کہ ہم حق غلامی سے ادا ہوں
تم بھی یہ دعا مانگو کہ ہم شہ پہ فدا ہوں

رخصت کے لئے لوگ چلے آتے ہیں باہم　　ہر قلب حزیں ہے، تو ہر اک چشم ہے پُرنم

ایسا نہیں گھر کوئی کہ جس میں نہیں ماتم غل ہے کہ چلا دل برِ مخدومۂ عالم

خدام کھڑے پیٹتے ہیں قبر نبی کے

روضہ پہ اُداسی ہے رسولِ عربی کے

تدبیر سفر میں ہیں ادھر سبطِ پیمبر گھر میں کبھی آتے ہیں کبھی جاتے ہیں باہر

اسباب نکلواتے ہیں عباس دلاور تقسیم سواری کے تردد میں ہیں اکبر

شہ کو جنہیں لے جانا ہے، وہ پاتے ہیں گھوڑے

خالی ہوا اصطبل، چلے آتے ہیں گھوڑے

حاضر درِ دولت پہ ہیں، سب یاور و انصار کوئی تو کمر باندھتا ہے اور کوئی ہتھیار

ہودج بھی کسے جاتے ہیں، محمل بھی ہیں تیار چلاتے ہیں درباں، کوئی آئے نہ، خبردار!

ہر محمل و ہودج پہ گھٹا ٹوپ پڑے ہیں

پردے کی قناتیں لئے فراش کھڑے ہیں

عوراتِ محلّہ چلی آتی ہیں بہ صد غم کہتی ہیں، یہ دن رحلتِ زہراؑ سے نہیں کم

پُرسے کی طرح رونے کا غل ہوتا ہے ہر دم فرش اٹھتا ہے کیا، بچھتی ہے گویا صفِ ماتم

غل ہوتا ہے ہر سمت، جدا ہوتی ہے زینب

ہر اک کے گلے ملتی ہے اور روتی ہے زینب

لے لے کے بلائیں یہی سب کرتی ہیں تقریر اس گرمی کے موسم میں کہاں جاتے ہیں شبیر!

سمجھاتی نہیں بھائی کو، اے شاہ کی ہمشیر! مسلم کا خط آلے، تو کریں کوچ کی تدبیر

للّٰہ ، ابھی قبر پیمبر کو نہ چھوڑیں

گھر فاطمہ زہراؑ کا ہے، اس گھر کو نہ چھوڑیں

وہ گھر ہے، فلک رہتے تھے جس گھر کے نگہباں کیوں اپنے بزرگوں کا مکاں کرتے ہیں ویراں

کوفے کی بھی خلقت تو نہیں صاحب ایماں بی بی! یہ مدینے کی تباہی کا ہے ساماں

ایک ایک شقی، دشمنِ اولادِ علیؑ ہے

شمشیر ستم واں سرِ حیدر پہ چلی ہے

اُجڑے گا مدینہ، جو یہ گھر ہوئے گا خالی بربادیٔ یثرب کی بنا چرخ نے ڈالی

کیا جانے پھر آئیں یا نہ آئیں شہِ عالی حضرت کے سوا کون ہے اس شہر کا والی

زہراؑ ہیں، نہ حیدرؑ، نہ پیمبر، نہ حسنؑ ہیں
اب اُن کی جگہ آپ ہیں یا شاہِ زمن ہیں

گرمی کا یہ دن اور پہاڑوں کا سفر آہ ان چھوٹے سے بچوں کا نگہبان ہے اللہ
رستے کی مشقت سے کہاں ہیں ابھی آگاہ ان کو تو نہ لے جائیں سفر میں شہ ذی جاہ
قطرہ بھی دمِ تشنہ دہانی نہیں ملتا
کوسوں تلک اُس راہ میں پانی نہیں ملتا

منہ دیکھ کے اصغر کا، چلا آتا ہے رونا آرام سے مادر کی کہاں گود میں سونا
جھولا یہ کہاں اور کہاں نرم بچھونا لکھا تھا اسی سن میں مسافر انہیں ہونا
کیا ہوگا جو میداں میں ہوا گرم چلے گی
یہ پھول سے کمھلائیں گے، ماں ہاتھ ملے گی

اُن بیبیوں سے کہتی تھی یہ شاہ کی ہمشیر بہنو! ہمیں یثرب سے لئے جاتی ہے تقدیر
اس شہر میں رہنا نہیں ملتا کسی تدبیر یہ خط پہ خط آئے ہیں کہ مجبور ہیں شبیر
مجھ کو بھی ہے رنج ایسا کہ کچھ کہہ نہیں سکتی
بھائی سے جدا ہو کے مگر رہ نہیں سکتی

مولوی عبدالحق

زمانہ

زمانے تین ہیں۔ گزشتہ، جسے ماضی کہتے ہیں۔ موجودہ، جو حال کہلاتا ہے۔ آئندہ، جس کا نام مستقبل ہے۔ ہر فعل کے لئے ضروری ہے کہ ان تینوں میں سے کسی ایک زمانے میں واقع ہو، لیکن بلحاظِ معانی و تکوین فعل کی تین حالتیں ہوں گی۔

ا۔ کام جو ابھی شروع نہیں ہوا، یعنی مستقبل۔

۲۔ کام جو شروع تو ہوا لیکن ختم نہیں ہوا، یعنی افعال ناتمام۔

۳۔ کام جو ختم ہو چکا، یعنی افعال تمام۔

مستقبل

ا۔ مستقبل مطلق میں زمانہ آئندہ کا علم تحقیقی ہوتا ہے، یا ایسا سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ مضارع میں احتمالی یا شرطی ہوتا ہے اور امر میں امکانی۔

۲۔ تمہیں پھر ایسا آدمی نہیں ملے گا، جہاں جاؤ گے میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ یہ مثالیں ایسی ہیں جن میں تحقیقی اور یقینی طور پر ایک امر کا بیان کیا گیا ہے۔ مگر بعض اوقات صرف ایسا سمجھ لیا جاتا ہے، گو حقیقت میں نہ ہو۔ مثلاً میں نے اگر وعدہ پورا نہ کیا تو لوگ کیا کہیں گے؟ وہ نہ آیا تو بڑی مشکل پڑے گی۔ تم امتحان میں کامیاب نہ ہوئے تو نوکری مشکل سے ملے گی۔

۳۔ بعض اوقات مصدر، ہونا، کا مستقبل مطلق، ہوگا، محاورے میں اس طرح مستعمل ہوتا ہے کہ وہ تمیز فعل کے معنی دیتا ہے مگر یہ ہمیشہ سوال کے جواب میں آتا ہے۔ جیسے وہ مکان بہت قدیم معلوم ہوتا ہوگا؟ جس کے معنی 'شاید' یا 'غالباً' کے ہیں۔

فعل حال

(الف)۔ حال مطلق: اصل میں تو یہ فعل حالاتِ موجودہ کو ظاہر کرتا ہے یا کسی ایسے کام کو جو اس وقت ہو رہا ہے لیکن ضمناً زمانۂ حال کے متعلق دوسرے معنی پیدا ہوتے ہیں،

مثلاً:

ا۔ عادت یا تکرار فعل: جیسے، جب وہ آتا ہے یہی شکایت کرتا ہے۔ شام کے کھانے کے بعد وہ روزانہ باغ کی سیر کو جاتا ہے۔ یہ دونوں بھائی ہر جگہ ساتھ آتے اور جاتے ہیں

۲۔ عام امور صداقت جو کبھی باطل نہ ہوں گے یا جن کی نسبت ایسا خیال کیا جاتا ہے جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ جو خلق اللہ کی

۳۔مستقبل قریب بلکہ قرب کے لئے۔جیسے، میں ابھی جاتا ہوں۔ابھی حاضر ہوتا ہوں۔حال ناتمام بھی بعض اوقات ان معنوں میں ہوآتا ہے۔جیسے، میں شہر جارہا ہوں۔

۴۔زمانۂ گزشتہ کے لئے جیسے حال حکائی کہتے ہیں۔جیسے، بابر ہندوستان پر حملہ کرتا اور افغانوں اور راجپوتوں کو شکست دیتا ہے ۔مولانا روم فرماتے ہیں، جو اندر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بے چاری معصوم لڑکی زمین پر پڑی تڑپ رہی ہے۔

۵۔بعض اوقات ایسے فعل کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو زمانہ گزشتہ میں شروع ہوا اور حال میں بھی جاری ہے۔جیسے، میں چند روز سے دیکھتا ہوں (یا دیکھ رہا ہوں) کہ یہ لوگ اپنا فرض پورے طور پر ادا نہیں کرتے۔

(ب) حال تمام۔جو اگرچہ بلحاظ زمانہ حال پورا ہو چکا ہے لیکن بعض اوقات سوائے اس کے اور معنی بھی دیتا ہے۔مثلاً

ا۔کبھی یہ ایسی جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں فعل تمام نہیں ہوا اور چاہئے تھا کہ حال مطلق استعمال ہوتا، لیکن محاورے میں حال تمام ہی لکھا اور بولا جاتا ہے۔جیسے: تم کیسے بے فکر بیٹھے ہو۔

۲۔بعض اوقات ایسے موقع پر جہاں از روئے قیاس ماضی ناتمام ہونی چاہئے تھی۔مثلاً: یہ لوگ کسی زمانے میں بڑے نامور گزرے ہیں۔پچھلے زمانے میں یہ بھی اپنا نام کر گیا ہے۔

۳۔بجائے ماضی مطلق۔جیسے، مجھے کل ہی بادشاہ نے خلعت عطا فرمایا ہے۔

۴۔بجائے حال حکائی یا ماضی مطلق۔جیسے، حدیث میں آیا ہے۔خدا نے فرمایا ہے۔قرآن میں لکھا ہے۔

ماضی

(الف)۔ماضی مطلق: ایسے فعل کو ظاہر کرتی ہے جو زمانہ گزشتہ میں بلاتعین وقت ہو، مگر علاوہ اس کے محاورے میں بعض دوسرے مقامات پر بھی استعمال ہوتی ہے۔مثلاً:

ا۔بعض اوقات حال کے بجائے۔جیسے، آپ یہاں بہت دنوں تک رہے (یعنی بہت دنوں سے ہیں)، یا حال تمام کے بجائے۔ جیسے، آپ بہت دنوں تک بچے رہے (یعنی بہت دنوں سے بچے ہوئے ہیں)۔اب یہاں تنکا تک نہیں رہا۔(نہیں رہا ہے)۔

۲۔بجائے حال مطلق۔جیسے، اس شہر میں جو آپ سے نہ ملا اس کا آنا یہاں بیکار رہا (یعنی جو آپ سے نہیں ملتا اس کا یہاں آنا بیکار ہوتا ہے)۔

۳۔بجائے مستقبل۔وہ آیا اور میں چلا (جس وقت وہ آئے گا میں چل دوں گا، یعنی اس کے آتے ہی چلا جاؤں گا) یا بول چال میں نوکر کو آواز دیتے ہیں ''یہاں آؤ''۔وہ جواب دیتا ہے ''آیا'' یا اس سے کہتے ہیں ''پانی لاؤ''، وہ کہتا ہے ''لایا''، ان میں مستقبل کے معنی

ہیں۔

(ب) ماضی ناتمام جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی خاص زمانہ گزشتہ میں کام جاری تھا۔اس کا اظہار مختلف صورتوں سے ہوتا ہے۔

(الف) وہ کالج میں پڑھتا تھا۔(ب) وہ کالج میں پڑھ رہا تھا۔(ج) وہ ایک مدت تک کالج میں پڑھتا رہا۔(د) وہ مدت تک کالج میں پڑھا کیا۔

صورت اول: فعل جاریہ بلاتعین و بہ تعین وقت ہے۔

صورت دوم: اس وقت استعمال ہوتی ہے جب ہم کسی وقت خاص یا مدت کا ذکر تے ہیں۔مثلا: جب میں وہاں گیا تو وہ کالج میں پڑھ رہا تھا۔

صورت سوم: ایسی حالت میں استعمال ہوتی ہے جب کہ زیادہ مدت کا اظہار کرنا مقصود ہو، یا جب اس کے ساتھ دوسرے فقرے میں اس سے کوئی نتیجہ نکالا جائے۔مثلاً: وہ ایک مدت تک کالج میں پڑھتا رہا مگر کچھ حاصل نہ کیا۔

صورت چہارم: صورت سوم کے مثل ہے یا بعض اوقات ایسے موقع پر استعمال ہوتی ہے جب کہ دو ایسے فعل متواتر جاری ہوں جن کا باہم تعلق ہے۔میں کہا کیا اور وہ سنا کیا۔

صورتِ سوم میں بھی اس طرح استعمال ہوتی ہے۔ ماضی ناتمام سے بعض اوقات خاص زمانے میں فعل کا بہ تکرار واقع ہونا بھی ظاہر ہوتا ہے۔مثلاً: جہاں کہیں وہ پہنچے تھے لوگ ان کا گرم جوشی سے استقبال کرتے تھے۔

بعض اوقات فعل امدادی حذف بھی ہو جاتا ہے۔جیسے جہاں کہیں وہ جاتے لوگ ان کا گرم جوشی سے استقبال کرتے۔

(ج) ماضی تمام: جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کام کو ختم ہوئے ایک مدت گزر چکی ہے۔جیسے، میں اس سے ملنے گیا تھا۔کبھی ماضی تمام ایک فعل گزشتہ کے فعل ماقبل کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے جیسے، وہ اس وقت آیا جب کہ میں کھانا کھا چکا تھا۔

مولوی عبدالحق

حروف جار

حروف جار کو حروف ربط بھی کہتے ہیں۔ حرف ربط وہ ہیں جو ایک لفظ کا علاقہ کسی دوسرے لفظ سے ظاہر کرتے ہیں۔

۱۔ کا، کے، کی۔

۲۔ نے۔

۳۔ کو، تئیں، سے، میں، تک، پر۔

یہ حرف ربط سادہ قسم کے ہیں جو عموماً اسم یا ضمیر یا تمیز کے ساتھ آتے ہیں اور ان کی حالت کا پتہ دیتے ہیں، مثلاً نمبر (۱) حالت اضافی کے لئے (۲) حالت فاعلی کے لئے (۳) حالت مفعولی ظرفی یا طوری کے لئے آتے ہیں۔

ان کے علاوہ اور بہت سے الفاظ ہیں جو حروف ربط کا کام دیتے ہیں مثلاً پاس، تلے، پیچھے، آگے، بیچ، سمیت، اوپر، نیچے، باہر، لئے، ساتھ، سنگ، سامنے، مارے۔ مگر یہ تمام الفاظ بجز ''سمیت'' کے اضافی حالت کے ساتھ آتے ہیں، جیسے اس کے پاس، صندوق کے نیچے، دھوپ کے مارے۔ ان میں سے بعض کی اصل سنسکرت ہے۔

اسی طرح بہت سے فارسی و عربی کے الفاظ بھی حروف کا کام دیتے ہیں جیسے بغیر، اندر، نزدیک، باعث، واسطے، سبب، سوا، طرح نسبت، بجا، بجز موجب، پیش پیش، قبل، گرد، درمیان، یہ الفاظ بھی اضافی حالت کے ساتھ آتے ہیں۔

ہندی کے بعض حروف ربط دو دو مل کر آتے ہیں اور ایک حرف کا کام دیتے ہیں۔ جیسے وہ چھت پر سے گر پڑا، نالی میں سے نکل گیا، یہ تو اس میں کا ہے، دیوار پر سے گر گیا۔

حروف ربط (جار) مفصلۂ ذیل اسما کے بعد آتے ہیں۔

سے:

(۱) اسم کے بعد۔ جیسے: احمد سے کہو۔ (۲) صفت کے بعد (جب بطور اسم مستعمل ہو)۔ جیسے: بد سے بچو، نیک سے ملو۔ (۳) ضمیر کے بعد: اس سے کہو۔ (۴) فعل کے بعد: اس کے سننے میں فرق ہے۔ (۵) تمیز کے بعد: آہستہ سے کہو۔

میں:

ظرف مکان کے ساتھ۔ جیسے،

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

وہ مجھے گلی میں ملا۔

جو دل میں ہے وہ زبان پر نہیں

'ح' خالی جیم کے پیٹ میں ایک نقطہ۔ منہ میں دانت پیٹ میں آنت۔ مرد ہو تو میدان میں آؤ۔ سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں جوتا۔ شیشے میں اتر آئی۔

ظروف زمان کے ساتھ : جیسے، آٹھ میں پانچ منٹ باقی ہیں۔ دیر میں آنے سے نہ آنا اچھا۔ سیر کا مزا چاندنی رات میں۔ سال میں ایک بار ہفتے میں چار بار۔ آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ۔ گھڑی میں تولا گھڑی میں ماشہ۔

حالت یا کیفیت، طور یا طریقے کے لئے۔ جیسے، وہ غصے میں ہے۔ رنج میں یا خوشی میں ہے۔ وہ مارے خوشی کے آپ میں نہیں سماتا۔ ہوش میں آؤ۔ اللہ کے نام میں برکت ہے۔ حرکت میں برکت۔ بتیس دانتوں میں ایک زبان۔ نام میں کیا دھرا ہے۔ بات میں بات پیدا کرتا ہے۔ دم آ گیا۔ اس کی زبان میں اثر ہے۔ ہاتھ میں شفا ہے۔ دل میں کھوٹ ہے۔

اظہارِ نسبت کے لئے۔ جیسے عمر میں بڑا۔ اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہے۔

مقابلے کے لئے۔ جیسے، مجھ میں اس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لاکھ میں ایک ہے، آدمی آدمی میں کیا فرق ہے۔

وزن کے لئے۔ جیسے، تول میں کم ہے، سیر میں چار چڑھتے ہیں۔

تعداد کے ساتھ۔ جیسے، دس آدمیوں میں تقسیم کرو۔ سو میں کہہ دوں، لاکھ میں کہہ دوں، بیس میں کیسے گزر ہوگا۔ تین میں نہ تیرہ میں۔ ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔

تمیز کے لئے۔ (کسی دوسرے اسم سے مل کر) جیسے، حقیقت میں، آخر میں، باتوں باتوں میں، ہنسی میں، خوشی میں وغیرہ۔

سے

کسی شئے کی ابتدا یا ماخذ کو ظاہر کرتا ہے۔ کبھی ابتداء بہ لحاظ مکان۔ جیسے سر سے پاؤں تک۔ بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ۔ اس سرے سے اس سرے تک۔ زمین سے آسمان تک۔ کہاں سے کہاں تک۔

بہ لحاظ زماں۔ جیسے، چھے بجے سے بیٹھا ہوں۔ صبح سے انتظار کر رہا ہوں۔ کل سے یہی عالم ہے۔ برسوں سے اس مخمصے میں گرفتار ہوں۔ مدت سے، قدیم سے وغیرہ۔

بہ لحاظ تعداد کے۔ چھے سے سات تک۔

ماخذ یا اصل۔ جیسے، وہ عالی خاندان سے ہے۔ یہ کہاں سے آیا ہے۔ زمین سے نکلا ہے۔ عین کی آواز حلق سے نکلتی ہے۔

نسبت یا علاقہ۔ جیسے، مجھے کام سے کام ہے اس سے مجھے کیا تعلق۔ اسے پڑھنے سے نفرت ہے۔ آنکھوں سے اندھا، کانوں سے

بہرا، دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔

مقابلہ۔ جیسے، وہ اس سے کہیں بہتر ہے۔ سختی سے شوم بھلا۔

استعانت۔ جیسے تلوار سے فتح کیا۔ قلم سے لکھا۔ ڈنڈے سے خبر لی۔ شاہ صاحب کی دعا سے اچھا ہو گیا۔

انحراف۔ جیسے قول سے، بات سے، وعدے سے پھر گیا۔ راستے سے لوٹ گیا۔

علاحدگی یا جدائی۔ جیسے، وہ نوکری سے الگ ہو گیا۔ کام سے گھبراتا ہے۔ شہر سے نکل گیا۔ کام سے جی چراتا ہے۔ دل سے اتر گیا۔

تمیز (کسی دوسرے اسم سے مل کر) جیسے خیر سے شوق سے، دل سے وغیرہ۔

(ف) بعض جملوں میں 'سے' اور 'کے' کے استعمال سے بین فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس موقع پر اس کا فرق بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً 'کمرے کے باہر اور کمرے سے باہر' میں فرق ہے۔ کمرے کے باہر کے معنی ہیں کمرے کے باہر کی طرف اور کمرے سے باہر یعنی کمرے کے اندر نہ ہونا۔ جیسے، کمرے کے باہر بیٹھو، کمرے سے باہر جاؤ۔

اسی طرح کس لئے اور کس کے لئے، میں فرق ہے۔ کس لئے کے معنی ہیں کیوں یا کس غرض سے اور کس کے لئے، یعنی کسی شخص وغیرہ کے واسطے۔

تک

انتہا کے لئے، بہ لحاظ مکان۔ جیسے، شہر تک سر سے پاؤں تک۔

بہ لحاظ زماں۔ جیسے، شام تک، مہینہ بھر یا سال بھر تک۔ چھ بجے تک۔

عام اشیاء اور خیالات کے لحاظ سے۔ جیسے، مجھ تک، اس کا نام تک نہ لیا خبر تک نہ ہوئی۔ سلام تک نہ لیا۔ اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ خیال تک نہ آیا۔ گمان تک نہ تھا۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک (غالب)

اصل میں 'اوپر' سے ہے 'پر' کا مخفف 'پہ' بھی (اہل لکھنو زبر سے اور اہل دہلی زیر سے بولتے ہیں) انہیں معنوں میں آتا ہے۔

'پر' کسی شئے کی اوپر کی سطح سے تعلق ظاہر کرتا ہے، خواہ متصل ہو یا منفصل۔ اس کے بعد قربت اور درمیان کے معنوں میں بھی آتا ہے۔

بہ لحاظ مکان۔ جیسے، خدا کا دیا سر پر، چھت پر، بنارس گنگا پر واقع ہے۔ دروازے پر کھڑا ہے۔

بہ لحاظ زماں۔ جیسے، وقت پر کام آیا۔

انحصار جیسے میری زندگی اسی پر ہے۔ ایک مچھی پر کیا ہے۔ سب کا یہی حال ہے۔

خاطر کے معنوں میں۔ جیسے، وہ نام پر مرتا ہے۔ روپئے پر جان دیتا ہے۔

واسطے کے معنوں میں آتا ہے۔ جیسے، کام پر گیا ہے، مہم پر گیا ہے۔
طرف کے لئے۔ جیسے، اس کی باتوں پر نہ جانا۔ اس پر کسی کا خیال نہ گیا۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

آگے

مکان کے لئے آتا ہے۔ جیسے،

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے (غالبؔ)

مقابلے کے لئے۔ جیسے میرے آگے اس کی کیا حقیقت ہے، یعنی میرے سامنے۔
زماں کے لئے جیسے

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی (غالبؔ)

ساتھ

ایک تو معیت کے عام معنوں میں ہے۔ دوسرے جب ضمیر کے ساتھ آتا ہے تو 'باوجود' اور باوصف کے معنی دیتا ہے۔ جیسے، اگرچہ اس وقت اس نے صاف جواب دے دیا لیکن اسی کے ساتھ آئندہ کا وعدہ بھی کیا۔

اختر الایمان سے ایک مکالمہ

(مصاحبہ کار: محمود ایاز)

محمود ایاز: ابھی پچھلے دنوں ایک انٹرویو میں اُردو کے دو ایک شاعروں کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا کہ یہ لوگ جو ہیں دراصل شاعر نہیں ہیں بلکہ (Versifiers) کلامِ منظوم کے شاعر ہیں۔ جب لوگوں کے بارے میں آپ نے یہ بات کہی وہ صحیح ہے یا غلط اس سے قطع نظر مجھے بات کی بنیادی نوعیت سے سروکار ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو تھوڑی وضاحت ہو جائے کہ ''کلام منظوم'' اور ''ورسی فکیشن'' سے آپ کی مراد کیا ہے؟

اختر الایمان: ہمارے یہاں شاعری تو ایک مدت سے ہوتی ہے اور شاعری میں ہم نے پہلے سے طے کر رکھا ہے کہ ایک وہ ہوتا ہے جسے ہم آمد کہتے ہیں اور ایک ہوتا ہے جسے ہم آورد کہتے ہیں۔ آمد میرے خیال میں وہ کلام ہے اس میں کمپلشن Compulsion ہے۔ اس کے ذہن کی، اس کے مزاج کی ذہنی افتاد کی یا جس کسی کی بھی ہے۔ اس لیے کہ وہ انٹرنل اندر کا کام ہے۔

محمود ایاز: یعنی یہ شاعری ایک فطری تقاضے کا نتیجہ ہوتی ہے؟

اختر الایمان: ہاں تو اس میں ایک ایسا ہوتا ہے کہ مثلاً کسی کا سہرا کہنا ہے تو غالب کی طرح ممکن ہے کہ اچھا بھی ہو جائے۔ لیکن سہرا ایک فرمائشی چیز ہے۔ کسی کے لیے قطعہ کہنا، کسی کا مرثیہ کہنا ہے تو ان میں آپ کو بیٹھ کر جبر کر کے اپنے ذہن پر اس کام کو، اس تخلیق کو بنانا پڑتا ہے اور ایک ہوتی ہے آپ کی ذہنی تخلیق جس کے بارے میں آپ نے بہت پہلے، دس سال پہلے بیس سال پہلے، پچاس سال پہلے طے کیا تھا کہ میرے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ میں شعر کہوں، شاعری کروں، ایک تو یہ لفظ شعر جو ہے یہ بڑی مشکل کی بات ہے اس لیے کہ یہ (شعر کی تلاش) تو غزل کا رویہ ہے۔ ہمارے یہاں شعر نظم میں ہوتا ہی نہیں ہے۔ مگر ہم پھر بھی یہ کہتے ہیں۔ غلط العوام ہی سہی مگر کہیں گے تو اسی طرح۔ تو یہ رویہ بہت پہلے بن گیا تھا کہ جس کام کے کرنے میں کوئی بیرونی جبر شامل نہیں اور جس میں آپ کی اندرونی صلاحیت اور بصیرت شامل ہے وہ کام جو ہے آمد کا ہے۔ وہ اسپانٹینیس پوئٹری Spontaneous poetry ہے، برجستہ کلام ہے اور ایک وہ ہے جس کو آپ سوچ سمجھ کر، طے کر کے مضمون بنا کے کہیں۔ وہ جو ہے وہ آورد ہے۔

محمود ایاز: مطلب یہ کہ کسی بیرونی دباؤ کے تحت جو شعر لکھا جائے گا۔

اختر الایمان: ہاں ہاں وہ سب ورسی فکیشن میں شامل ہیں۔

محمد ایاز: اس بات کا پتہ کیسے چلے گا کہ جو نظم آپ کے پیش نظر ہے وہ بیرونی تقاضے کے تحت لکھی گئی ہے یا اندرونی تقاضے کے تحت؟

اختر الایمان: وہ صحیح ہے وہ درست بات ہے، لیکن اس کے لیے کوئی فارمولا بنا نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک شعری بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔

محمود ایاز: اصل چیز وہ ہے۔

اختر الایمان: ہاں یہ شعری بصیرت جو ہے اس کا کوئی فارموں نہیں۔ محمود ایاز یہاں پر آپ کو دراصل کہنا یہ ہے کہ جس شعر کے بارے میں، جس نظم کے بارے میں، غزل کے بارے میں، قاری کی، ناقد کی شعری بصیرت یہ فیصلہ کرے کہ اس میں بھرتی ہے اس میں شعریت نہیں ہے، حسن و تاثیر نہیں ہے، اس سے آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہ جو ہے وہ بیرونی جبر کا نتیجہ ہے۔

اختر الایمان: ہاں اور یہ کہ یہ کلام منظوم ہے۔

محمود ایاز: اگر بیرونی جبر کا پہلے پتہ لگائیں پھر شعری بصیرت ڈھونڈیں تو شعری بصیرت کا تو کام رہتا نہیں وہاں پر۔

اختر الایران: نہیں نہیں مگر شعری بصیرت ہوتی کتنے آدمیوں کے پاس ہے؟

محمود ایاز: بات انہی کی ہے جن کے پاس ہے۔

اختر الایمان: بس۔

لیکن اب یہ دیکھیے کہ آپ غزل کے بارے میں کہتے ہیں، آپ کا خیال ہے اور کسی حد تک صحیح ہے کہ اس میں بڑا کام جو ہونا تھا ہو گیا اور اب اور کوئی بڑا کام اس سے نہیں لیا جا سکتا۔ غزل کے کچھ حدود کی لمیٹیشن Limitation ہیں۔ ان کی حد تک اس نے کام کیا اور ابھی کام ہوتا رہے گا۔ لیکن نظم جو کام کر سکتی ہے وہ غزل سے ممکن نہیں ہے۔

اختر الایمان: میں.....میرا کہنا یہ ہے.....

محمود ایاز: ہاں ہاں میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں مگر یہ دیکھیے کہ آپ کے نظم کے معنی ہمارے یہاں کیا ہیں۔ ایک تو نظم ہوتی تھی ہمارے پاس مثنوی اور.....

اختر الایمان: نہیں نظم جو ہے، ہمارے یہاں مثنوی تو تھی۔ مثنوی کے بعد ہمارے یہاں نظم کا کوئی خاص تصور (نہیں ملتا) ہمارے بزرگ شعرا تک کے ہاں نہیں۔ مثلاً اب میں نام لوں گا آپ کہیں گے میں نے فلاں کو رد کر دیا۔

محمود ایاز: میں بالکل نہیں کہوں گا مجھے بہت خوشی ہوگی۔

اختر الایمان: ہمارے یہاں مثلاً جو بڑے شعرا تھے کہ ان کی نظم کا جو تصور ہمارے ذہن میں آج ہے۔ ایک مربوط تصور وہ نہیں تھا ان کے پاس۔ مثلاً پہلے یہ تھا کہ ایک رنگ کی بات کو سو رنگ سے باندھیں۔

محمود ایاز: ایک موضوع پر دس طرف سے چوٹ پڑ رہی ہے۔

اختر الایمان: تو مطلب یہ ہے کہ آپ نے موسم کے بارے میں کہنا شروع کیا، کہے چلے جا رہے ہیں کہے جا رہے ہیں.....موسم

کے جتنا پھیلاؤ، اس کے بعد آپ مزاج پر آ گئے، کہے چلے جا رہے کہے چلے جا رہے ہیں۔ اس کو۔

اختر الایمان: آپ سمجھتے ہیں کہ یہ نظم ہے۔

محمود نیاز: شاید میں نے اپنی بات واضح نہیں کی۔ مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ آپ نے آمد اور آورد کا جو معیار بنایا ہے شاعری اور Versification میں تمیز کرنے کے لیے تو وہ غزل کی شاعری میں تو شاید بہ آسانی کام دے جائے، لیکن نظم میں یہ مشکل ہے۔ غزل سے جب ہم نظم کو ممیّز کرتے ہیں Distinguish، کرتے ہیں۔ اس کے وسیع کینوس کی بات کرتے ہیں تو اس کے (Inherent) اندر مطلب یہ ہے کہ نظم دو چار مصرعوں میں بات کرنے والی صنف نہیں۔

اختر الایمان: نہیں وہ بھی ہوتا ہے۔

محمود ایاز: ہوتا تو وہ بھی ہے لیکن دراصل نظم ہے وسیع کینوس کی چیز بنیادی طور پر۔ یہ اور بات ہے کی مختصر نظم کے طور پر بھی استعمال ہو جائے۔ ہمارے پاس پوری اُردو اور فارسی شاعری کی روایات ہیں۔ اس میں مثلاً ''فردوسی کا شاہ نامہ'' بہت بڑی چیز ہے۔ لیکن اتنے ہزار اشعار کی مثنوی میں کتنے اشعار ایسے ہیں جہاں آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ''از دل خیزو بر دل ریزو'' دل سے بات نکل رہی ہے اور دل پر اثر کر رہی ہے۔ یعنی یہاں آپ کا مقرر کردہ آمد آورد کا معیار کام نہیں دے گا۔

اختر الایمان: نہیں، اس میں ہوتا یہ ہے.....

محمود ایاز: نہیں، میں آپ سے عرض کرتا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ جہاں آپ کوئی ایک موضوع رکھیں گے اور موضوع ہر منطقی ربط تسلسل کے ساتھ، ایک Respecting ایک تناظر رکھ کر بات کریں گے تو جس طرف زندگی کا ہر لمحہ پر مسرت نہیں ہوتا۔ ہر لمحہ نشاط یا کرب کا نہیں ہوتا۔ مختلف گونا گوں پہلو ہیں تو ان سب کے بیان میں بوریت بھی آئے گی۔ بے کیفی اور سپاٹ پن بھی آئے گا۔ بیانیہ نظم آپ لکھ رہے ہیں فردوسی کی طرح تو اس میں مناظر ہیں، محل اور قلعے ہیں، لباس اور وضع قطع ہے۔ ہتھیار اور اسلحہ ہیں، جنگ کے مناظر ہیں، تو ان سب باتوں میں ہر جگہ تو دل سے نکلنے والی بات آئے گی نہیں اور آپ کے نقطہ نظر سے شاہ نامے کا بڑا حصہ کلام منظوم کے ذیل میں آ جائے گا۔

اختر الایمان: نہیں نہیں.....

محمود ایاز: نظم کی پرکھ میں اس طرح سے اگر آمد اور آورد کے معیار کو استعمال کر دیں تو پھر اُردو کے شاعروں اور اُردو کے پڑھنے والوں کے جس رویے سے آپ کو شکایت ہے کہ یہ لوگ دو مصرعے سن کر فوراً تڑپ اٹھنے کی بات چاہتے ہیں وہی بات آ جائے گی۔

جہاں نظم طویل ہوگی وہاں آپ کے آمد اور آورد کے معیار کو ملحوظ رکھنا ممکن نہیں رہتا۔ یہ معیار صرف غزل کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔

اختر الایمان: نہیں نہیں.....رویہ.....وہ بھی ہوتا ہے۔ اس میں الفاظ کا استعمال تو ہوتا ہے نا؟ آپ داد تو الفاظ کو دیتے ہیں۔

لیکن جو بڑا کام ہے جیسے ''فردوسی کا شاہ نامہ'' ہے یا اور بڑی نظمیں ہیں۔ان میں بات یہ ہوتی ہے کہ وہ بھی ایسا نہیں کہ شعری بصیرت کے بغیر اچھے لکھے جائیں۔ یہ جو ہے۔آپ شاہ نامہ بھی لکھیں۔دو ہزار اشعار، پانچ ہزار اشعار بھی لکھیں لیکن قلم برداشتہ لکھتے نہیں چلے جاتے۔

آپ کا ذہن یا جب تک آپ کی شعری بصیرت ساتھ دیتی ہے.....

محمود ایاز: دہ کرافٹس مین شپ ہوتی ہے۔آپ کو لکھنا ہے۔الفاظ پر آپ کو عبور ہے۔مشاقی ہے۔الفاظ ہاتھ باندھے کھڑے ہوئے ہیں۔یہ جو الفاظ کو منظّم کرتا ہے کلام میں یہ کرافٹس مین شپ ہے۔

اختر الایمان: وہ ہے، درست ہے۔لیکن میں کہتا ہوں کہ آمد جو ہے وہ پہلا جملہ ہوتا ہے۔ذہن کا یا ایک خیال آتا ہے اور جسے آپ شکل دیتے ہیں نظم کی۔اس کے بعد آورد کا حصہ تو ہوتا ہے مگر وہ آورد آمد کے ساتھ اتنی مل جاتی ہے کہ اسی لیے۔لکھنے میں وقت کیوں لیا جاتا ہے کہ آپ نے ایک طویل نظم کہی۔اس کے بعد آپ چپ ہیں کہ اس پر نظر ثانی کر دیں۔کیوں نظر ثانی کرتے ہیں؟ اس لیے کہ پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تو میں جبر کر رہا ہوں۔

محمود ایاز: یعنی احساس ہوتا ہے کہ بات بنی نہیں، اظہار میں حسن نہیں ہے۔

اختر الایمان: پانچ مصرعے نکال دیں گے۔دس سطریں نکال دیں گے، چار ٹکڑے نکال لیں گے، آدھی نظم بدل دیں گے۔میں اپنی ایک نظم کا بتاؤں۔بہت پرانی نظم ہے ''پگڈنڈی''

محمود ایاز: بہت اچھی نظم ہے۔

اختر الایمان: میں نے وہ نظم کی چھوٹی بحر میں۔اچھا چھوٹی بحر میں تھی مگر جس طرح میرے ذہن میں بات تھی وہ نظم پوری ہوگئی۔آج وہ نظم بھی میرے پاس نہیں ہے اس کی کاپی بھی نہیں ہے۔مجھے یاد بھی نہیں ہے۔اسے کہنے کے بعد مجھے لگا کہ نظم تو ہے یہ مگر جس طرح میں چاہتا تھا وہ نہیں ہے۔تو میں سوچتا رہا کہ کیا کروں۔پھر اس کے بعد میرے ذہن میں ایک دوسری بحر آئی اور وہ پوری نظم جو ہے اس کو تو میں نے اُٹھا کر رکھ دیا اور از سرِ نو نظم لکھی۔

محمود ایاز: پھر وہ چیز ہی نئی بن گئی۔

اختر الایمان: ہاں نئی۔میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تخلیقی کام جو ہے، چاہے وہ بڑا کام بھی ہو، اس میں آمد کا بڑا حصہ رہتا ہے۔شعری بصیرت اس سے نکل کر نہیں جاتی۔

محمود ایاز: اب میں آپ سے ذرا سی وضاحت اس بات کی طلب کروں گا کہ آمد کا جو لفظ آپ استعمال کرتے ہیں، کیا آپ کے ذہن میں اس کا کوئی خاص مفہوم ہے؟ ہمارے ہاں شاعری میں آمد کا لفظ جن معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس کی وجہ سے سننے والوں کو ذرا غلط فہمی ہو سکتی ہے۔کچھ کھل کر کہیں تو بات یوں ہو سکتی کہ جب شعر میں تاثر، جذبہ احساس کی ترسیل کیفیت نہ ہو تو یہ عموماً اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ بات اوپر سے لادی جا رہی ہے۔

اختر الایمان: اب میں جو.....

محمود ایاز: ہاں تقریباً یہی بات ہے نا؟؟

اختر الایمان: نہیں، میں جس طرح میں اک مثال ہمارے پاس کوئی ہے تو نہیں شاعری میں اپنی شاعری۔

محمود ایاز: خیر میں آپ سے عرض کروں، قلع کلام معاف، مثلاً یہ کہ اقبال کی شاعری کے بارے میں دو متضاد قسم کی آرا ہیں۔ کچھ لوگ شاعری نہیں مانتے، صرف مفکر یا فلسفی مانتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ صاحب وہ تو فلسفہ ولسفہ بہت تھا ان کے ہاں شعر تو انھوں نے کہا نہیں کچھ۔

اختر الایمان: لیکن صاحب شعر تو فکر تو.....

محمود ایاز: جی ہاں، وہ تو میں نے عرض کیا تا کہ دو طرح کے لوگ ہیں، کچھ ایسے بھی ہیں جو ان کی ہر چیز کو شاعری اور اچھی شاعر بھی سمجھتے ہیں مثلاً جب یہ کہتے ہیں۔

سبق پڑھ پھر شجاعت کا صداقت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

تو یہ جذبہ ہے، جس خیال کا یہ شعر میں اظہار ہے، ممکن ہے وہ اس میں صادق ہیں، دل سے یقین رکھتے ہیں، اندرونی کمپلشن سے کہہ رہے ہیں لیکن یہ شاعری نہیں بکواس ہے۔

اختر الایمان: اتنا حصہ تو ہمیشہ.....

محمود ایاز: اچھا اب وہی اقبال مستقبل کے بارے میں کہتے ہیں:

آبِ رواں کبیر، تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب

تو یہ شاعری ہے۔ پہلا شعر محض خطابت ہے اور وہ بھی بری خطابت۔

اختر الایمان: اب اتنی چھوٹ تو آپ کو ہر فنکار کو دینی پڑے گی۔

محمود ایاز: گرفت یہاں کر کون رہا ہے۔ ہم تو صرف بات کر رہے ہیں۔ گرفت یہاں ہے ہی نہیں۔

اختر الایمان: اتنی چھوٹ تو دینی پڑے گی، کیونکہ کچھ حصہ ہمیشہ آوردکار ہے گا۔ کچھ آمدکار ہے گا۔ کچھ جبر کا۔ کچھ اسپان ٹینیٹی کا۔

محمود ایاز: جبر کی ایک نوعیت یہ ہے کہ وہ باہر والا جبر نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات لکھنے والا عمر کے ساتھ، وقت کے ساتھ اور بیرونی دنیا میں قدر و قیمت کے بدلتے ہوئے پیمانوں کے پیشِ نظر، اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے، خواہش کرنے لگتا ہے کہ میری منڈی میں کچھ اور مال بھی ہونا چاہیے، میری شاعری میں کچھ اور چیزیں بھی آنی چاہئیں اور کچھ پر مزید Emphasis بڑھنا چاہیے (مثلاً اقبال کو دیکھ کر سیماب اور جوش کی کوششیں)۔

اختر الایمان: نہیں نہیں، ایسا تو نہیں ہوتا ہے۔

محمود ایاز: ہوتا ہے کچھ لکھنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

اختر الایمان: ممکن ہے کچھ لوگوں کے ساتھ ہو۔

محمود ایاز: تو اس کے ساتھ شعری رویے میں بھی فرق آتا ہے۔ کچھ شعری پیداوار میں بھی آتا ہے۔ مثلاً آپ کا تازہ مجموعہ جو آیا ہے اس کے نام سے میرے ذہن میں بات آئی کہ یہ زمین جو ہے آپ سے بری طرح چمٹی ہوئی یا آپ اس سے چمٹے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ زمین سے آپ کا تعلق نیا ہے، لیکن ویسا نہیں ہے، یہ تو بہت برسوں سے ہے، مگر فرق یہ ہے کہ پہلے آپ اسے تاریک سیارہ کہتے تھے اور اب ''زمین زمین'' کہتے ہیں۔

اختر الایمان: لیکن.....

محمود ایاز: کچھ نہیں، صرف فرق دیکھئے اس میں رویے کا۔

اختر الایمان: ہاں اس لیے.....

محمود ایاز: دونوں میں بات ایک ہی ہے، بلکہ شاید زمین زمین میں کاٹ زیادہ ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تاریک سیارے میں استعارہ تھا۔ یہاں استعارہ نہیں ہے۔ ویسے استعارے کے بغیر بھی بات اگر کرنے کی طرح کی جائے تو دل تک پہنچتی ہے۔ ادھر جو نظمیں آپ کی ہو رہی ہیں، ان میں یہ بات میں نے محسوس کی ہے۔ ویسے میں آپ کی شاعری کا مداح ہوں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں۔ آپ کی شاعری کو میں نے.....

اختر الایمان: کہتے تو تم یہی ہو بھائی۔

محمود ایاز: جی ہاں اور سچ کہتا ہوں۔ ورنہ میں یہاں بات کرنے کیوں بیٹھتا؟ تو یہ ورسی فلیکشن کی جو بات آپ نے دوسروں کے بارے میں کہی تھی، وہاں سے میں نے اپنی بات اسی لیے شروع کی تھی کہ دراصل مجھے یہ کہنا تھا کہ آپ کی ادھر کی نظموں میں یہ Versification والا معاملہ کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے۔

اختر الایمان: ہو سکتا ہے۔ دیکھئے میں تو ہمیشہ یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کچھ کہتے ہیں، شاعر کچھ کہتا ہے یا لکھتا ہے (تو تب تک) وہ اس کا ہے۔ اس کے بعد.....

محمود ایاز: اس کے بعد وہ دوسروں.....

اختر الایمان: ہاں ایک بار وہ چیز چھپ گئی تو لوگوں کے پاس چلی گئی تو وہ پبلک پراپرٹی ہو گئی۔ میں نے جو ٹھیک سمجھا وہی کیا، مگر میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس میں ورسی فلیکشن بھی دکھائی دے سکتا ہے۔ میں اپنے طور پر کہہ سکتا ہوں کہ میرے ذہن میں ورسی فلیکشن کی کوئی بات نہیں تھی۔

محمود ایاز: مجھے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح کہ لاشعوری طور پر ہی سہی، آپ اپنا دفاع بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہ کچھ ''آب جو''

کے دیباچے ہی سے، شروع ہوا تھا اور بعد کے دیباچوں میں بھی جاری ہے۔ اب مجھے ایک بات بتائیے۔ ایک زمانہ تھا ترقی پسند تحریک کے عروج کا۔ اس وقت آپ کو دانستہ یا نادانستہ طور پر تقریباً نظر انداز کرنے کی کوشش رہی۔ ویسے نظر انداز نہیں ہوتا کوئی کسی کے کرنے سے۔ اس کے بعد میں سمجھتا ہوں تقریباً 60 کے بعد اوائل سے جو ہمارے سوغات کا زمانہ تھا، وہاں سے آپ کی شاعری کی طرف توجہ زیادہ مبذول ہونے لگی۔ نئے لکھنے والوں نے آپ کو وہ درجہ دیا، وہ داد تحسین دی، جس کی شاعری مستحق تھی۔ آپ کا دائرہ اثر بنا۔ آپ نے ضرور محسوس کیا ہوگا کہ وہ کیا چیز تھی جس کی وجہ سے ایک دور کے جو مقبول ترین لوگ تھے، وہ نظروں سے گر گئے اور آپ کی شاعری نظروں میں چڑھی؟ یہ جو ورسی فلیکشن والی بات ہے، میں نے اس سے اپنی بات اسی لیے شروع کی تھی کہ اس کے کئی پہلو ہیں۔ اس پورے دور میں جن لوگوں نے شاعری موقتی موضوعات پر کی اور لکھنے کا انداز بھی اتنا ہی موقتی تھا کہ اس کی اپیل زیادہ دور نہیں جا سکتی تھی۔ اس کے برخلاف آپ کے کلام کی جو خوبی تھی، وہ آہستہ آہستہ کھلی اور بڑے Imperceible طور پر اندر سے کام کرتی رہی۔ میں نے شاید اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ آپ کی شاعری چونکاتی نہیں، پڑھنے والے کو فوراً اپنی گرفت میں نہیں لیتی، بلکہ بڑا آہستہ آہستہ سحر کرتی ہے۔ جادو جگاتی ہے اپنا اور اس خوبی کا فقدان تھا ان لکھنے والوں کے ہاں جو ترقی پسند تحریک کے زمانے میں عروج پر تھے۔ یہ آپ کی شاعری کی بہت بڑی خوبی تھی جو دوسروں کے ہاں نایاب تھی۔ اب جو ادھر آپ کے ہاں تبدیلی آ رہی ہے، آپ کے الفاظ میں ''ورسی فلیکشن'' بڑھ رہا ہے، اس کا آپ کو شعور ہے یا ایسے ہی ہو رہا ہے؟ یا آپ پڑھنے والوں کو یہ محسوس کرا رہے ہیں کہ کبھی اس طرح بھی ہوتا ہے یا ہونا چاہیے اور ہو رہا ہے۔

اختر الایمان: میں یہ کہتا ہوں کہ جب میں لکھتا ہوں میرے سامنے یہ مقصد بھی رہتا ہے، زبان کو وسعت دینے اس کا طریقہ یہ ہے۔

محمود ایاز: آپ نے شاعری اس لیے تو نہیں شروع کی کہ آپ کے ذمے کسی نے یا اللہ نے یا کسی غیبی قوت نے زبان کی توسیع کا کام سونپا ہے؟

اختر الایمان: نہیں بالکل نہیں۔

محمود ایاز: یہ سب باتیں ہیں۔ بات پھر وہیں آ گئی۔ ترقی پسندوں کی۔ وہ کسی اور مقصد کے لیے لکھتے تھے۔ آپ نے مقصد کچھ اور کر لیا۔ یہ تاویل.....

اختر الایران: میرا مقصد یہ نہیں۔ قطعی نہیں بلکہ زبان کو وسعت دینے سے میرا مطلب یہ نہیں کہ لوگ پڑھیں گے۔ بولنے لگیں گے، بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے.....

محمود ایاز: Explore کرنا زبان کے امکانات کو۔

اختر الایمان: شاعری کے لیے۔

محمود ایاز: اپنے اظہار کے لیے الفاظ کے امکانات کو Explore کرنا۔

اختر الایمان: اس کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے آپ ایسے موضوع بھی لیں جو نان پوائنٹ ہوں۔

محمود ایاز: موضوع سے کچھ ہوتا ہی نہیں.....

اختر الایمان: نہیں، موضوع.....

محمود ایاز: موضوع سے کچھ ہوتا ہی نہیں۔ مشین پر بہت خوبصورت نظمیں لکھی گئیں۔ اصل چیز وہ شاعری ہے۔ کہنے کا انداز، آپ کی اپروچ، لفظیات۔

اختر الایمان: میں جب اس طرح سے کہتا ہوں Hard معلوم ہوتی ہیں، سخت معلوم ہوتی ہیں۔

محمود ایاز: ایک اور بات آپ نے ''زمین زمین'' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ چوما چاٹی کی باتیں اس کی بھی ایک عمر ہوتی ہے، مگر آپ نے تو چوما چاٹی کی باتیں زندگی میں کسی بھی وقت نہیں کیں۔

میں آج یہ عہد توڑتا ہوں

یہ رسم وفا ہی چھوڑتا ہوں

یا

تم کہاں ہو، بہشت نگہ، مہر من

تم کہاں ہو؟ مری روح کی روشنی

تم تو کہتی تھیں ہے درد پائندہ ہے

یا

''سنا ہے تم اک پھول سی جان کی ماں بن گئی ہو''

تو کیا آپ ان کو چوما چاٹی کی باتیں سمجھتے ہیں؟ دراصل لکھنے والا چیزوں کو اپنے اپنے خاص حوالوں سے دیکھتا ہے۔ ٹائن بی وقت کو تہذیبوں اور تمدنوں کے عروج وزوال کی شکل میں دیکھتا ہے وہ اس کے حوالے ہیں۔ آپ کے یہاں زندگی کا ہر معاملہ، ہر واقعہ ایک محبت ایک گمشدہ محبت جو ہے وہ آپ کا Basic حوالہ ہے ہر چیز کے لیے وہ رنگ بدلتا رہتا ہے۔

اختر الایمان: نہیں وہ.....

وقت کے گزرنے کا احساس؟

گم شدہ تو میرے خیال میں نہیں ہے، اس کی تلاش جو ہے وہ زیادہ ہے۔ گم شدگی کا کہیں وہ آجاتا ہے۔

محمود ایاز: بعض چیزیں آپ کی شاعری میں وہ بڑے تواتر کے ساتھ آتی ہیں۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں برا ہے۔ اب اگر Repitition تو سب سے بڑی برائی اللہ میاں کر رہے ہیں؟ جو مستقل انسان کو پیدا کیے چلے جا رہے ہیں۔

اختر الایمان: سب اپنے خیال کی بات ہے۔

محمود ایاز: ہے نا؟ اور پھر اللہ میاں احسن الخالقین ہیں۔ جب وہ تو اتر سے باز نہیں آتے تو پھر ہمارا کیا ہے۔

اختر الایمان: ہاں وہ درست ہے ہر شخص اپنے اپنے طریقے سے دیکھتا ہے، اپنے دماغ سے سوچتا ہے۔

محمود ایاز: دراصل مجھے کسی اور سے غرض نہیں، مجھے آپ کے رویے سے ہے۔ اس لیے کہ آپ کی شاعری مجھے ذاتی طور پر پسند ہے اور پھر یہ خیال کہ اب تک اُردو شاعری میں ہندو پاک میں سب سے موثر، سب سے توانا آواز آپ کی ہے تو آپ اپنی شاعری میں یا اپنی شاعری کے بارے میں جو بھی بات کریں گے، وہ دوسروں کے لیے روشنی کا، ہدایت کا بھی باعث ہوگی اور گمرہی کا بھی۔

اختر الایمان: میں.....

محمود ایاز: جی ہاں میں آپ ہی کی بات کرتا ہوں۔ اگر آپ کہہ دیں کہ ہر شخص اپنے اپنے طریقے سے سوچتا ہے تو پھر کہنے سنے کی کوئی بات نہیں رہتی۔

اختر الایمان: میں تو جو کچھ کہنا ہوتا ہے دیباچے میں کہہ دیتا ہوں۔

محمود ایاز: یعنی برنارڈ شاہ والی بات۔ وہ تو پہلے دیباچے لکھتے تھے، بعد میں ڈراما۔

اختر الایمان: تو میں کہہ دیتا ہوں، حالانکہ نظم پہلے کہی جاتی ہے۔

محمود ایاز: جی وہ تو ہے میں ویسے ہی برنارڈ شاہ کی بات کر رہا تھا۔

اختر الایمان: کچھ موضوعات مجھے پسند ہوتے ہیں، کبھی ایک نظم شروع کرتا ہوں پھر چھوڑ دیتا ہوں۔ کبھی ایک مصرع لکھا کبھی چھوڑ دیا۔ زمانے کے بعد خیال آتا ہے کہ کہیں ہوتا ہے آدھا پونا پھر چھوڑ دیتا ہوں۔ ممکن ہے یہ جو کچھ کوشش ہے، پہلے پکڑ میں نہ کی، کوشش کرنا پھر پکڑ میں نہ آنا، اس کی وجہ سے شاید آپ کو یہ ورسی فلیشن محسوس ہوتا ہے۔

☆☆☆

اردو ادیبوں سے ملاقات

(10 جولائی 2005 کو کرناٹک اردو اکاڈمی میں سلام بن رزاق سے اردو ادیبوں اور ادب نوازوں کی ملاقات ہوئی جو زائد از تین گھنٹے جاری رہی۔ شرکائے تقریب میں بنگلور اور ریاست کے ممتاز اہل قلم اور اہل ذوق شریک تھے جن میں جناب محمد اقبال سب ایڈیٹر روزنامہ ''سالار''، محترمہ فریدہ رحمت اللہ صاحبہ ایڈیٹر ''زریں شعاعیں''، مزاح نگار ڈاکٹر حلیمہ فردوس، دوماہی ''ظرافت'' کے ایڈیٹر جناب عظیم الدین عظیم، خاکہ نگار ڈاکٹر فوزیہ چودھری، نقد نگار ڈاکٹر زبیدہ بیگم، شعبہ اردو بنگلور یونیورسٹی کی سینئر لکچرر ڈاکٹر مہ نور زمانی، لکچرر ڈاکٹر اقبال النساء اور لکچرر محترمہ یاسمین محمدی بیگم، محمد منظور نعمان لکچرر، ڈاکٹر عبدالمناف لکچرر، محترمہ مبینہ بانو، شعبہ اُردو، مترجمِ اقبالؒ، جناب سید احمد ایثار صاحب، اردو اکاڈمی کے سابق چیرمین پروفیسر عبدالغفار شکیل، افسانہ نگار نعیم اقبال، یوسف عارفی، الف احمد برق، فیاض قریشی، محترمہ سمیرا حیدر، جناب کشور کولاری، ریسرچ اسکالر جناب عبدالحمید، جناب بشیر احمد، جناب تلک راج سیٹھ، محترمہ تسنیم شاہد، لکچرر، داؤد محسن لکچرر اور جناب مظہر محی الدین کے علاوہ ادب نوازوں اور شعبہ اُردو، بنگلور یونیورسٹی کے طلبہ کی کثیر تعداد موجود تھی۔ صدر، کرناٹک اردو اکاڈمی پروفیسر م ن سعید نے صدارت کی اور جناب مظہر محی الدین رکن اکاڈمی نے نظامت فرمائی۔ اس تقریب کی قیادت صدر شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی ڈاکٹر معین الدین جینابڑے نے کی۔)

ڈاکٹر معین الدین جینابڑے نے آغاز میں تقریب کے مقاصد کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس نشست کی نوعیت مکالمے کی سی ہے اور شرکاء تقریب سلام بن رزاق کے ساتھ راست مکالمہ قائم کر سکتے ہیں۔ چونکہ سلام بن رزاق کے ساتھ میرے دیرینہ اور قریبی تعلقات ہیں، اس لئے تبادلۂ خیال کے دوران میں ان پر بھی اظہار خیال کرتا رہوں گا۔ سلام اپنے ابتدائی دنوں میں افسانہ نگار نہیں بننا چاہتے تھے بلکہ شاعر بننا چاہتے تھے۔ سلام صاحب سے گزارش ہے کہ آپ نے شاعری کو آزمایا اور افسانے کی طرف آئے۔ اس کے بارے میں بتایئے؟

سلام بن رزاق: میرے بچپن میں شاعری کی چھوٹی چھوٹی کتابیں جیسے نورنامہ، مولودنامہ وغیرہ خواتین مجلسوں میں پڑھا کرتی تھیں۔ سن سن کر میں بھی نظمیں لکھنے لگا اور ہماری زبان اور دوسرے پرچوں میں بھیجنے لگا۔ اس دور کے ایک دو قطعات یاد ہیں جیسے:

جدائی زہر نہیں بلکہ زہر قاتل ہے
مگر یہ زہر ہلاکت بھی پی رہا ہوں میں
میرا وجود تیری ذات کا رہین نہیں
تیرے بغیر بھی اے دوست جی رہا ہوں میں

حیات نو کے سفینے کو کھے رہا ہوں میں
خراج وقت کے طوفان سے لے رہا ہوں میں
جسے ہو عزم شہادت وہ آئے میرے ساتھ
صلیب و دار سے آواز دے رہا ہوں میں

جینا بڑے: سلام صاحب آپ کی ابتداء شاعری سے ہوئی پھر آپ نثر کی طرف کیسے آئے؟

سلام بن رزاق: نسیم حجازی، صادق سردھنوی وغیرہ کی کتابیں ہم پڑھتے تھے۔ جاسوسی دنیا میں شروع سے پڑھتا رہا۔ ابن صفی میرے پسندیدہ رائٹر رہے ہیں۔ داستانوں وغیرہ کا اثر مجھ پر ہوتا رہا ہے۔ پھر کسی وقت خیال آیا کہ شاعری میں میں اپنے خیالات کو جیسا چاہتا تھا ایسا ڈھال نہیں پا رہا ہوں۔ پھر میں نے افسانوں کی طرف اور مرہٹی ترجموں کی طرف توجہ کی اور وہ لکھے گئے اور چھپنے لگے اور پسند کئے گئے۔ ریسپانس ملنے لگا تو میں اپنی بات کو زیادہ وضاحت اور صراحت کے ساتھ بیان کرنے لگا۔ شاعری میں نے چھوڑ دی ہے لیکن شاعری میں نے پڑھنا نہیں چھوڑا۔

جینا بڑے: آپ کو سنتے ہوئے یہ محسوس ہوا کہ آپ کا تخلیقی سفر دینیات کے سہارے شروع ہوا۔ اب ہمیں یہ بتا دیجئے کہ نور نامہ اور مولود نامہ سے، میں جانتا ہوں آپ کے افسانے میں ایک ہیرو من ویزداں پڑھتا ہے اور آپ یہ بھی کہتے ہیں میں واسو ہوں تو یہ بتایئے کہ آپ من ویزواں تک کیسے پہنچے اور آپ کی ذہنی اور فکری نہج میں کیا انقلاب آیا۔

سلام بن رزاق: حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ جوں توں میٹرک کر لیا اور پلومیل میں ایک دو برس ملازمت کی اور ممبئی آ گئے۔ اس وقت تک ایک مذہبی ماحول تھا میرا۔ یہاں دوست احباب کچھ ایسے ملے جو پڑھے لکھے بھی تھے اور ذرا روشن خیال بھی تھے۔ ان سے جب میرا ربط ضبط بڑھا تو کچھ نئی کتابوں کے نام معلوم ہوئے ان میں نیاز فتح پوری کے من ویزداں کا بڑا چرچا تھا۔ وہ میرے مطالعے میں آئی۔ اس کے مطالعے کے بعد میرے ذہن سے بہت سے تعصّبات کے جالے جو تھے وہ بالکل صاف ہو گئے۔ ایک فکری تبدیلی میرے ذہن میں آئی اس کتاب نے ایک وسیع مفہوم میں چیزوں کو دیکھنے کی طرف راغب کیا ہے۔ اس نے زندگی پر آزادانہ غور کرنے کا ایک راستہ دکھایا۔ غالب کے مطالعے نے بھی ایک ذہنی کشادگی پیدا کی۔

ڈاکٹر فوزیہ: میں آپ سے یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ جب کسی واقعے یا صورت حال سے متاثر ہوتے ہیں تو اسے افسانے میں کس طرح ڈھالتے ہیں۔ ایک ہی نشست میں لکھتے ہیں یا کئی نشستوں میں۔ سنا ہے کہ منٹو ایک ہی نشست میں اپنی افسانہ ٹائپ کر دیا کرتے تھے یا بیدی کو ہر چلتے پھرتے آدمی میں ایک افسانہ نظر آتا تھا۔

سلام بن رزاق: منٹو نے ہر افسانہ اس طرح نہیں لکھا۔ لیکن یہ مشہور ہے کہ پیسوں کی ضرورت کبھی انہیں مجبور کر دیتی تھی تو اس طرح لکھ بھی لیتے تھے۔ بیدی ہر افسانے کو چھان پھٹک کر بہت غور سے لکھتے تھے۔ باقر مہدی جب ''اظہار'' نکالتے تھے تو انہوں

نے بیدی کا افسانہ ''ایک باپ بکاؤ ہے'' شامل کیا۔ رسالہ پریس کو جا رہا تھا کہ بیدی کا فون آیا کہ باقر افسانے میں فلاں لفظ کی جگہ فلاں لفظ ڈال دینا۔ میرے ساتھ ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی خیال ذہن میں آیا اور میں نے فوراً افسانہ لکھ دیا۔ مثلاً میرا افسانہ ''چادر'' 1993 کے ممبئی کے فسادات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا آخری واقعہ جس میں ایک لڑکے کو جلا دیا جاتا ہے، مجھے میرے ایک ہندو دوست نے سنایا تھا اور کہا تھا کہ مجھے اپنے لوگوں سے نفرت ہوگئی ہے وہ واقعہ دیکھنے کے بعد- میرے ذہن میں وہ واقعہ محفوظ ہوگیا اسے افسانہ بنتے بنتے تقریباً تین برس لگ گئے۔ دوسرا افسانہ ایکلویا۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے لڑکے کو تکنیکل لائن میں داخلہ دلانا چاہتا تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ اگر میں OBC کا سرٹی فکیٹ لایا تو داخلہ مل سکتا ہے۔ میں OBC کا سرٹی فکیٹ لا نہیں سکتا تھا۔ یہ چیز مجھے haunt کرتی رہی۔ افسانہ اسی خیال کو بنیاد بنا کر رکھا گیا۔

داؤد محسن: یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ ''ادب کے خاندان میں افسانے کی حیثیت چھوٹے بیٹے کی سی رہی ہے جو اگرچہ خاندان کا فرد ہے لیکن ولی عہدی سے محروم رہتا ہے'' - یہ جانتے ہوئے بھی آپ نے افسانہ نگاری کو کیوں اپنایا؟ دوسرے، ناول کے احیاء کے زمانہ میں افسانے کی وقعت پہلے سے بھی کم ہے۔ کیا آپ نے محض منہ جھوٹا کرنے کی خاطر افسانہ نگاری کو اپنایا ہے؟

جینا بڑے: جواب یہ ہے میرے بھائی کہ سلام کی افسانہ نگاری کے تیس برس بعد شمس الرحمان فاروقی نے افسانے کی حمایت میں کے عنوان سے کتاب لکھی اور پوری کتاب افسانے کی مخالفت میں لکھی۔ یہ بات آپ نے اس میں سے اٹھائی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ادب میں یہ بات ثابت ہوگئی۔ معاف فرمایئے ہمارے ادب میں یہ بات ثابت نہیں ہوئی۔ اصناف کو اس طرح سے بھڑایا نہیں جاتا۔ ہر صنف اپنا ایک کام کرتی ہے اور جو کام ایک صنف کرتی ہے دوسری صنف وہ کر نہیں سکتی۔ دوسری باتیں سلام کے فن سے راست تعلق نہیں رکھتیں۔ سر، عبدالغفار شکیل صاحب آپ کچھ کہنا چاہیں گے!

عبدالغفار شکیل: آپ کے افسانوں میں میں نے جو خوبی پائی وہ ان کا کہانی پن ہے۔ لیکن آپ دوسرے trends جیسے تجریدی افسانہ یا اینٹی افسانہ جیسے اثرات سے کس حد تک متاثر یا مرغوب ہوئے؟

سلام بن رزاق: ہم نے لکھنا شروع کیا تھا تو ترقی پسندی کا زوال تھا اور جدیدیت اپنا مقام بنا رہی تھے۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ ترقی پسندی کا اکہرا افسانہ ہم لکھنا نہیں چاہتے تھے اور ہم تجریدیت اور جدیدیت کے چیستاں میں بھی اپنے آپ کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔ لہذا ہمیں ایسا راستہ اختیار کرنا تھا جو ان دونوں سے بین بین ہو۔ ہم جدیدیت کو پوری طرح رد بھی نہیں کرتے۔ صرف اس کے فیشن کو رد کرتے ہیں جیسے علم ہندسہ کے اشکال وغیرہ کو افسانے کا نام دیا جائے۔ ہم اس کے خلاف ہیں۔ لہذا اس کی عمر بھی بہت کم تھی۔ وہ آئے اور گئے۔ افسانہ بنیادی طور پر میں سمجھتا ہوں جیسے لفظ کہانی کا

مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس کو آپ کہیں اس کا Gist پورا افسانہ سنا سکیں تو کیا بات ہے۔ اگر آپ اس کی تھیم بھی سنا سکتے ہیں تو کم از کم اس کا کہانی پن برقرار رہے گا۔ ہم نہ ان سے بہتر بننا چاہتے تھے نہ ان کے خلاف جانا چاہتے تھے۔ لیکن ہم ان سے مختلف اپنا راستہ ضرور تلاش کرنا چاہتے تھے۔ میں نے علامتی افسانے لکھے ہیں لیکن میری علامتوں کی تہہ تک لوگ پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سے معنی اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چھوٹی سی مثال ندی کی ہے۔ پچیس برس پہلے پروفیسر قمر رئیس نے اس کا تجزیہ کیا تھا۔ کل یوسف عارفی نے بھی اس کا تجزیہ پیش کیا۔ مزید اقبال النساء نے بتایا کہ انہوں نے بھی اس کا تجزیہ کیا ہے- یہ میرے لئے واقعی خوشی کی بات ہے کہ ایک کہانی کے بار بار تجزیے کئے جاتے ہیں۔ اب وہ علامتی کہانی ہی ہے جس کا الگ الگ interpretation کیا گیا۔ اب سریندر پرکاش کی ایک کہانی تلقار مس کا اکثر ذکر ہوتا ہے۔ لیکن ان کہانیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے کہانی کو گمراہ کیا۔ خالص تجریدی کہانی۔ اب اس کا تجزیہ کون کرے گا۔ بے شمار ایسی کہانیاں ہیں اب جن کا ذکر نہیں ہوتا۔ وہ زمانہ گزر گیا۔ اب کہانی تہہ دار بھی ہے اس میں علامت بھی ہے اس میں بیانیہ بھی ہے، گہرائی بھی ہے۔ کسی بھی اچھی تخلیق کی یہی بنیادی خوبی ہونی چاہیے۔

حلیمہ فردوس: آپ سے ایک سوال ہے کہ آپ نے ایک حالیہ انٹرویو میں ایک بات کہی ہے کہ اول تو آپ کرشن چندر کی رومانویت سے متاثر رہے اور میچور ہونے کے بعد کیا آپ محسوس کرتے ہیں کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ تاثرات آپ کے فن پر حاوی رہے۔

سلام بن رزاق: بالکل صحیح کہا آپ نے- ابتدائی دنوں میں اور آج بھی یہ ہوتا ہے کہ نوجوانی کے دور میں کرشن چندر بہت اپیل کرتے ہیں۔ مجھے بھی متاثر کیا انہوں نے۔ ان کی زبان میں وہ جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ جیسے جیسے تجربات و مشاہدات اور مطالعہ بڑھتا گیا اور دنیا کو ہم نے دیکھنا شروع کیا تو ہمیں یہ لگا کہ وہ افسانے اچھے تو ہیں اپیل تو کرتے ہیں مگر ان میں گہرائی نہیں ہے۔ وہ بہت دیر تک ہماری فکر کا ساتھ دینے والے افسانہ جو ہے وہ منٹو کا ہے، بیدی کا ہے، کہیں کہیں ہم کو عصمت چغتائی بھی اچھی لگتی ہیں۔ انتظار حسین ہیں، اس کے بعد یہ سب لوگ جو آئے سامنے ہمارے تو ہم نے ان کو پڑھا تو ایسا لگا کہ عمر کے ساتھ ساتھ اور اپنے تجربوں اور مشاہدوں کے ساتھ ساتھ تو یہ ہمارے زیادہ قریب ہیں۔

حلیمہ فردوس: بالکل رواں دواں نثر جوندی کی طرح بہہ رہی ہے، بالکل اس رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے گو کہ وہ انشائیہ انداز نہیں ہے جو کرشن چندر میں ہے۔ غیر شعوری طور پر ہی سہی یہ رنگ جھلکتا ہے۔

سلام بن رزاق: بالکل سچ کہا آپ نے کہ میں اس سے متاثر ہوا ہوں۔ لیکن کرشن چندر کے ہاں جو نثر تھی، وہ نثر یعنی جو بات وہ کہنا چاہتے تھے وہیں تک تھی۔ اس کی حد وہیں تک تھی۔ لیکن کہیں میں یا میرے جیسے کچھ اور دوست احباب جو نثر لکھتے ہیں تو یہ نثر جو ہے، ایک قرات میں تو سمجھ میں آجاتی ہے لیکن دوسری قرات میں اس کا ایک دوسرا مفہوم بھی نکلتا ہے جس کو ہم تہ داری کہتے ہیں۔ تو ہم نے کوشش یہی کی کہ ہمارے جملوں میں اکہرا پن جو ہے وہ نہ آنے پائے۔ جو بات ہم کہہ رہے ہیں،

اس میں تہ داری بھی ہو۔اس میں الگ الگ پہلو بھی نکلیں،تو اگر فرض کیجئے کہ یہ خوبی کسی میں آجاتی ہے، مجھ میں کیا ہے، کتنی ہے مجھے نہیں معلوم۔ اگر یہ ہے تھوڑی بہت خوبی تو یہ میری خوش قسمتی ہے اور آپ لوگوں کا بڑا پن ہے جو اس کی تعریف کر رہے ہیں۔لیکن یہ خوبی ہر نثر میں ہونا چاہیے کہ تہ داری کے بغیر وہ اپیل کر ہی نہیں سکتی۔

فریدہ رحمت اللہ: آپ کے افسانے دیو جانس کلبی جدید کا کردار کتوں میں گھرا ہوا ہے اور آخر میں خود بھی بھونکنے لگتا ہے۔کیا اس کے پیچھے آپ کا کوئی ذاتی تجربہ ہے!

سلام بن رازاق: یہ افسانہ تقریباً 35 برس تو پرانا ہوگا-72 میں چھپا مگر لکھا ستر کے آس پاس یہ میرے ابتدائی افسانوں میں سے ہے۔اس کا عنوان رکھا تھا میں نے کتوں کا مسیحا-جب میں نے شب خون کو بھیجا تو ہمارے شمس الرحمان فاروقی صاحب نے خط لکھا کہ وہ افسانہ ہم شائع کر رہے ہیں لیکن عنوان میں بدل رہا ہوں۔اس کا عنوان ہوگا دیو جانس جدید-میں نے غور کیا تو مجھے لگا کہ یہ عنوان زیادہ بہتر ہے۔جیسا کہ آپ جانتے ہیں دیو جانس سکندر کے زمانے کا فلاسفر تھا۔یہ میرا تجربہ تھا اور تجربہ کس قسم کا تھا یہ کہنا تو مشکل ہے کیونکہ کتے تو میں پالتا نہیں اور خدا کے فضل سے کتوں کی طرح بھونکنا بھی مجھے نہیں آتا۔لیکن میرا مشاہدہ ضرور ہے اور وہی میں نے پیش کیا۔جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس زمانے میں ممبئی کے مضافات میں مدرس تھا۔جھونپڑ پٹی کا علاقہ تھا جہاں کے بچے بالکل غیر مہذب، گالم گلوچ کرتے تھے، ان کو پڑھانے سے زیادہ انہیں سنبھالنا دشوار مرحلہ ہوتا تھا-اس کا چھوٹا سا ایک واقعہ ہے۔جب ہم نے ان کو سمجھایا کہ بھئی دیکھو جب بزرگ ملیں گے آپ کو، تو سب سے پہلے سلام کیا کرو تو ایک عادت ان میں پڑ گئی کہ سلام کرتے تھے۔تو خود میرے ساتھ ایک واقعہ یہ ہو گیا کہ وہ اسکول چالیوں میں چلتا تھا۔بلڈنگ نہیں تھی۔بیت الخلاء کے لئے سامنے میونسپلٹی کے اس میں جانا پڑتا تھا جس کے دروازے ٹوٹے پھوٹے تھے۔ایک بار استنجاء کے لئے اس ٹوائلٹ میں گیا اور دروازہ جیسے ہی میں نے کھینچا تو وہاں پر ایک بچہ جو ہے فارغ ہو رہا تھا۔اس نے کہا سر، سلام علیکم (ہنسی)۔اس قسم کے ماحول میں بچوں کو پڑھاتا تھا۔تو پڑھاتے پڑھاتے میرے ذہن میں کچھ ایسی باتیں آئیں کہ جو کر رہا ہوں کن بچوں کو تربیت دے رہا ہوں۔کس ماحول میں، غالباً وہ کرب اور اس ماحول کا اثر میرے ذہن پر ہوا اور میں نے یہ افسانہ لکھا۔اس افسانے کے کئی interpretations ہوئے ہیں۔جیسے وہ سائنس داں ہے اور سائنس داں جس قسم کے تجربے کرتے ہیں ان کا حشر یہی ہونے والا ہے-ظاہر ہے کہ میں اپنے افسانے کے سارے رموز اور نکات بیان نہیں کر سکتا۔آپ غور کریں اور خود ہی اسے انٹر پریٹ کریں تو زیادہ بہتر بات ہوگی کیوں کہ تخلیق کار خود کوئی بات کہتا ہے تو بات محدود ہو جائے گی اور میں اپنے افسانے کو محدود نہیں کرنا چاہتا۔

جینا بڑے: ضروری نہیں ہے کہ ایسا ہو۔جب تخلیق کار سے ہم روبرو بات کر رہے ہیں تو ہم یہ تو جانیں کہ تخلیق کار خود کیا بات کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔اتنا تو قاری کا حق ہے اس موقع کی رعایت سے وہ بات کہہ بھی دیں کہ آپ نے کیا بات کہنے کی

کوشش کی ہے۔ تکثیر معنی اور معنی کا انتشار یہ دو الگ الگ صورت میں ہوتی ہیں۔ یہ بحث طلب مسئلہ ہے کہ وہاں معنی کی کثرت کے امکانات کو کھنگھالا جا رہا ہے یا پھر یہ خواب جو ہے کثرت تعبیر کا شکار ہو رہا ہے۔ ادب کے طالب علم کو آپ کی موجودگی سے بہت بڑا فائدہ ہوگا۔ آپ ہمیں یہ بتا دیں کہ وہ کیا بات تھی جو آپ اس کتوں والے افسانے میں کہنا چاہ رہے تھے۔

سلام بن رزاق: شعر العجم میں مولانا شبلی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ جہانگیر کے زمانے میں طالب آملی آئے اور جہاں گیر کی فرمائش پر اشعار پیش کئے۔ جہاں گیر کی خواہش پر انہوں نے اس کا مطلب بھی بتا دیا۔ اسی دربار میں ایک اور عالم نے اس کی تشریح کی تو طالب آملی نے اعتراف کیا کہ ان کی تشریح میری تشریح سے بہتر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ افسانہ لکھ دیا جاتا ہے۔ پڑھنے والے اس کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خاص طور پر علامتی افسانے کی ایک تشریح کرنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ علامتی افسانہ کسی ایک نکتے کو لے کر نہیں لکھا جاتا۔ اس کے کئی Dimension ہوتے ہیں۔ تو یہ علامتی افسانہ اگر ہے آپ لوگوں کے نزدیک تو اس کے بھی کئی Dimension ہو سکتے ہیں۔ ایک اور مثال دے دوں۔ بشیر بدر اب سے چالیس پینتالیس برس پہلے بہت بڑا نام تھا۔ جب وہ مشاعروں میں جانے لگے اور لوگوں سے انہیں واہ واہ ملنے لگی تو وہ اپنی شاعری کو اس داد کے لالچ میں اس معیار پر ڈھالنے لگے جس معیار کا لوگ تقاضہ کرتے تھے۔ تو ان کی شاعری کا حشر یہ ہوا جو آج ہو رہا ہے۔ ان کی شاعری صرف مشاعروں کی شاعری ہو کر رہ گئی ادب میں اس کا کوئی مقام نہیں۔ پچھلے پچیس تیس برس سے انہوں نے کوئی اچھا شعر نہیں کہا۔ لہذا آدمی بھی سامنے کی چیزوں سے متاثر ہو کر اس کا اثر اگر قبول کرتا ہے اور اس میں ڈھل جاتا ہے تو وہ اپنی انفرادیت کو کھو دیتا ہے۔ غالباً یہی تھیم میرے افسانے کے اندر رہی ہو۔ اسی خیال کے ساتھ اور کتنے خیالات جڑ گئے اور کتنی باتیں اس میں شامل ہو گئیں یہ کہنا مشکل ہے۔

جینا بڑے: سلام صاحب شاید آپ خود یہ کہنا پسند نہیں کریں گے کہ آپ نے کیا بات کہنے کی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں وہ افسانہ خلق ہوا۔ میں عرض کروں اردو افسانے کی تاریخ کا سنگ میل ہے ایک افسانہ ''آدھے گھنٹے کا خدا'' جس زمانے میں وجود کی لایعنیت یا alienation کی باتیں ہو رہی تھیں اور زندگی بیزاری فیشن بن گیا تھا اس وقت کرشن چندر نے زندگی کی بھرپور معنویت کو آدھے گھنٹے کے وقفے میں سمیٹ کر رکھ دیا تھا۔ بہت بڑا طنز تھا اس افسانے میں۔ یہ کہا گیا کہ یہ ہندوستان اور پاکستان کی سرحد ہے۔ کرشن چندر نے کہا کہ صاحب یہ جو آپ کہہ رہے ہیں آپ کی باتیں سننے کے بعد میں بھی اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میرے پاس ایک locale تھا اور المیہ کردار تھے۔ اور اس Locale اور ان کرداروں سے کون سے معنی اخذ کئے جاتے سکتے تھے، یہ experiment مجھے کرنا تھا۔ میں نے کر کے دیکھ لیا اب آپ مجھے بتا رہے ہیں کہ یہ ایسا ہے تو ایسا ہوگا۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا فنکار اتنا دیانت دار ہو جائے کہ وہ کہہ دے کہ ہم یہ بات کہنا چاہ رہے تھے لیکن اس کے کہہ دینے کے بعد اگر اس کے فن پارے میں وہ وقعت ہے تو وہ گھٹے گی نہیں بڑھے گی۔ لہذا آپ جو retreat کر جاتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ صاحب میں اگر کہہ

دوں تو یہ محدود ہو جائے گا۔ آپ ہوتے کون ہیں اس کو محدود کرنے والے۔ افسانہ آپ نے لکھ دیا۔ اب وہ آپ کی ملک بھی نہیں رہا اب وہ ہر اس شخص کا ہو گیا جس نے اسے پڑھا اور جس نے اسے پسند کیا۔ آپ پر یہ واجب ہے کہ آپ بڑی دیانت داری سے کہہ دیں کہ بھائی ہم یہ بات کہنا چاہتے تھے۔ بہر کیف اس طرف سے کوئی سوال آ رہا تھا.....

زبیدہ بیگم: آپ کے تینوں مجموعوں کے افسانوں کی روشنی میں میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ آپ اپنے کرداروں میں جھانک کر ہمارے ورثے کی بچی کھچی رمق کو باہر نکالنے کا اہتمام کر رہے ہیں۔ کیا یہ سچ سمجھا جائے۔

سلام بن رزاق: دیکھئے افسانے کی جو ظاہری سطح ہوتی ہے وہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ افسانے کے اندرون میں جھانک کر انسان کی نفسیات کو کھنگھالنا ہی اصل چیز ہے۔ ایک clue افسانہ نگار کو مل جائے تو وہ اس کی مدد سے اس کے کردار کی ساری پرتیں کھول کر رکھ دیتا ہے۔ میں افسانہ نگار کی حیثیت سے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ ان میں مجھے کوئی کوئی ایسی چیز مل جاتی ہے جس سے وہ میرے کردار بن جاتے ہیں۔ اگر میں کہیں کہیں ان میں کامیاب ہوں تو یہ میری خوش بختی ہے۔

سمیرا حیدر: آپ افسانے جدید تناظر میں لکھتے ہیں؟

سلام بن رزاق: جدید تناظر کیا چیز ہے! میں عصری تناظر میں لکھتا ہوں اور چیزیں عصری تناظر میں ہی لکھی جاتی ہیں۔

سمیرا حیدر: کیا آپ سریندر پرکاش سے متاثر ہیں؟

سلام بن رازاق: کبھی میں سریندر پرکاش سے متاثر تھا بعد میں سریندر پرکاش خود مجھ سے متاثر ہوئے۔ (ہنسی) یہ میں اپنی بڑائی کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں۔ سریندر پرکاش تجریدی افسانے لکھتے تھے۔ علامتی افسانے لکھتے تھے۔ ان کے آخری مجموعے میں بیانیہ افسانے ہیں اور میں نے بیانیہ اور کہانی پن کے ساتھ لکھے ہیں۔ یہ یقیناً ہماری صحبتوں یعنی نئے کہنے والوں کا اثر تھا۔

اقبال النساء: آپ کے افسانوں کے کردار زیادہ تر شکست خوردہ ہیں۔ افسانے کے اختتام تک آتے آتے وہ ہار جاتے ہیں۔ ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ کیا یہ قاری کیلئے یہ ایک طرح کی حوصلہ شکنی نہیں ہے۔

سلام بن رزاق: بہت اچھا سوال ہے۔ میں اس سوال کا انتظار کر رہا تھا۔ بعض اوقات ہوتا یہ ہے کہ ہر افسانہ نگار کا ایک محبوب موضوع ہوتا ہے اور وہ اس موضوع سے نکل نہیں پاتا ایک عرصے تک۔ جیسے ہمارے انتظار حسین۔ ان کا محبوب موضوع ہجرت ہے۔ ان سے یہ سوال پوچھا گیا کہ آپ کے سارے افسانوں میں ہجرت بار بار کیوں نمودار ہوتی ہے؟ آپ اس موضوع کو دہراتے رہتے ہیں کیوں؟ انہوں نے بڑا اچھا جواب دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ جس موضوع کو میں دہراتا ہوں اس کے اتنے پہلو ہیں، اتنے dimensions ہیں، اتنی گہرائی ہے اور اتنی گیرائی ہے اس میں اتنی گہرائی تک اترا ہوا ہے کہ جب تک میں اس سے عہدہ برآ نہ ہو جاؤں اس موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف کیسے توجہ کروں۔ لہذا میرے ہاں بھی جو ہے کچھ

اس طریقے سے رہا ہے کہ شروع کے جو میرے افسانے تھے وہ انسانی رشتوں میں جو illusion ہے، انسانی رشتوں پر تو اب بھی لکھتا ہوں میں، وہ میرے افسانوں کا موضوع بنا کرتے تھے۔ البم سے لے کر انجام کار تک۔ پھر موضوعات میرے دھیرے دھیرے بدلتے گئے۔ ایک چیز جو کہی جاتی ہے کہ کردار میرے مفاہمت پسند ہیں، شکست خوردہ ہیں اور ہار جاتے ہیں یہ سب درست ہے کیوں کہ زندگی میں کون نہیں ہارتا۔ کون جو ہے مفاہمت نہیں کرتا۔ میرے آس پاس یہی کردار ہیں۔ میرا ہر کردار ابھیمنو کی طرح زندگی کے چکرویو میں داخل ہو گیا ہے، باہر نکلنے کا منتر وہ نہیں جانتا۔ لیکن وہ شکست خوردہ نہیں ہے، وہ جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ میرے کسی کردار نے آج تک خودکشی نہیں کی، زندگی سے ہار نہیں مانی، وہ ہیرو نہیں ہے۔ میں نے ہیروز کی کہانیاں نہیں لکھی ہیں کیونکہ میرے زمانے میں کوئی ہیرو ہے ہی نہیں۔ انجام کار کے حوالے سے یہ بات چلی تھی کہ ہمارے بزرگ باقر مہدی کا انجام کار کی اس بات کو پھیلانے میں زیادہ حصہ ہے۔ انہوں نے میرا نام ہی انجام کار رکھ دیا تھا۔ لیکن جب گوپی چند نارنگ نے اس کا تجزیہ کیا تو آخر میں لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے کہ کردار شراب کے اڈے پر جاتا ہے اور شراب کا آرڈر دیتا ہے تو مالک نے لنگی چڑھا رکھی ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ آدمی مجھ سے لڑنے آیا ہے۔ لیکن جب وہ سے پاؤ موسنبی کا آرڈر دیتا ہے تو وہ جس نے لنگی کے چھور پکڑ رکھے ہیں وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتے ہیں۔ تو یہ علامت کس بات کی ہے؟ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کی ایک لہر آئی اور گزر گئی۔ یعنی اس کردار کو اندر سے کسی نے لرزا دیا۔ اس کو خوف زدہ کر دیا۔ تو یہ مفاہمت پسندی تھوڑی ہے۔ اسے ان کے ساتھ جینا ہے۔ وہ فلم کا ہیرو تھوڑی ہی ہے کہ ڈھشم ڈھشم کیا اور پانچ سات کو لڑھکا دیا اور ہیرو بن گیا۔ وہ تو عام آدمی ہے، وہ آپ اور ہم ہیں، ہم خود اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ ہم کہاں کہاں مفاہمت کرتے ہیں۔ میں نے داستانوں کے ہیرو کو اپنی کہانیوں میں الٹا کر دیا ہے۔ عام آدمی کو پیش کیا ہے۔ یہ میرا مطمح نظر ہے کوئی اسے اتفاق کرے یا نہ کرے فرق نہیں پڑتا۔

الف احمد برق: میں نے آپ کے جتنے افسانے پڑھے ہیں جیسے بیعت وغیرہ زیادہ تر بیانیہ افسانے ہیں۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے بلکہ میرے تمام ساتھیوں نے یہ محسوس کیا ہے کہ آپ اپنے کرداروں کو بولنے کا موقع کم دیتے ہیں۔ ساری باتیں آپ ہی کرتے رہتے ہیں۔ آپ زیادہ کیوں بولتے ہیں؟ (ہنسی)

سلام بن رازاق: (مسکراتے ہوئے) مفاہمت کرنے والا کہاں زیادہ بولتا ہے۔ خیر! برق صاحب نے جس افسانے کا حوالہ دیا اور شمع کا حوالہ دیا، وہ افسانے بیس سال پہلے شائع ہوا تھا۔ میں نے وہ افسانہ rewrite کیا اور ''آواز گریہ'' کے نام سے شائع کرایا۔ اس لئے شاید اس کا تاثر بڑھ گیا ہے۔

بیعت کے تعلق سے ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ ممبئی میں ٹائمز آف انڈیا کی ایک اسٹرائک چلی جس میں میرے ایک

دوست کام کرتے تھے۔ انہوں نے ملازمین کا ساتھ دینے کی کوشش کی اور تقریر وغیرہ کی۔ منیجمنٹ نے ان کو بلا کر کہا کہ آپ کو یہاں ملازمت کرنی ہے یا چھوڑنی ہے۔ وہ جس کرب سے گزر رہا تھا اسی کرب کو میں نے اس افسانے میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ رہی یہ بات کہ میرا کردار بولتا ہے یا نہیں بولتا ہے یہ منحصر ہے سچویشن پر- آواز گریہ میں کردار نے اپنی آنکھوں سے جو دیکھا ہے مجبوری کی آنکھوں سے وہ بیان کیا ہے۔

محمد اقبال: سلام صاحب میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ بجوکا پر گوپی چند نارنگ کی تنقید سے کیا آپ متفق ہیں؟

اسلام بن رزاق: ذرا میں پس منظر بتادوں کہ پہلے تو وارث علوی صاحب نے ایک مضمون لکھا تھا جس میں بجوکا کی انہوں نے بہت تعریف کی تھی اور تجزیہ کیا تھا۔ آخری جملہ یہ لکھا کہ اردو ادب میں وہ ایک یادگار افسانہ رہے گا۔ اب یہ دیکھئے کہ ہمارے ناقدین کے جو رویے ہیں یہ بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ میں کسی کو کوئی الزام لگانا نہیں چاہتا۔ میرے دونوں بزرگ ہیں اور دونوں نے میری تعریف کی ہے۔ نارنگ صاحب نے انجام کار کے تجزیہ میں بتایا کہ علامتیں بیانیہ افسانے میں بھی ہو سکتی ہیں اور انہوں نے علامتیں تلاش کیں۔ اتنا خوب صورت تجزیہ تھا کہ پاکستان میں جب انہوں نے مضمون پڑھا تو میرے ایک دوست نے وہاں سے لکھا کہ بھائی وہ تجزیہ پیش کر رہے تھے تو لوگ محفل میں اس طریقے سے داد دے رہے تھے جیسے مشاعروں میں داد دی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ وارث علوی صاحب کو انہیں کہیں let down کرنا تھا تو انہوں نے وارث صاحب کی اس تنقید کو جو انہوں نے بجوکا کے حوالے سے کی تھی، انہوں نے ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ کی نفی کر دی۔ میں بالکل متفق نہیں ہوں کیونکہ یہ جو انہوں نے لکھا وارث صاحب کے صرف جواب میں لکھا ہے۔

دیانت داری انہوں نے انجام کار میں استعمال کی ہے- یہ بھی کہا ہے انہوں نے، کہا کہ بجوکا کی جو علامت میں نے استعمال کی ہے نارنگ صاحب نے کہا کہ اس میں ایسا نہیں ہے۔ اور وارث علوی نے یہ بات کہی ہے کہ وہ شخص نامرد نہیں ہے، وہ صرف لجلجا کیرکٹر ہے۔ اس کی چاہت عورت کے لئے ایک عذاب بن جاتی ہے۔ آپ ذرا زندگی کے آس پاس دیکھیں تو ایسے کردار دکھائی دیں گے جو بہت زیادہ جو ہے دم ہلاتے رہتے ہیں عورتوں کے سامنے۔ کیا عورتیں ایسے کرداروں کو پسند کرتی ہیں؟ وہ لڑکی گاؤں سے چلتی ہے گاؤں کا کھلا ماحول اور ندی اور مچھلی پکڑنا شفق وغیرہ کی پروردہ لڑکی اچانک شہر میں آتی ہے اور شوہر بھی ایسا ملتا ہے جو ایسا لجلجا کردار ہے اور اس کو دن بھر کمرے میں قید کر دیا گیا ہے تو وہ کردار کیسے خوش رہ سکتا ہے۔

محمد اقبال: اس طرح ہر کردار سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ کبھی اٹھانا بھی چاہیے کرداروں کو- آپ انہیں ذرا سی ٹھیس بھی نہیں پہنچانا چاہتے۔

سلام بن رزاق: آپ افسانہ نگار سے وہ تقاضے کریں جو آپ چاہتے ہیں تو پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ حق تو کسی کو نہیں پہنچتا کہ وہ تقاضا کرے کہ تخلیق کار وہ لکھے جو وہ چاہتے ہیں۔ افسانہ نگار تو وہی لکھے گا جو وہ چاہتا ہے، جو وہ دیکھتا ہے، جو اس کے تجربے، جو اس کے مشاہدے میں آیا ہے۔

جینا بڑے: تخلیق کار وہی لکھتا ہے جو اس کا تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ ساحر کی تلخیاں میں ایک شعر تھا جو انہوں نے بعد میں حذف کر دیا۔

دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

دنیا جو آپ کو جو کچھ دیتی ہے اس کو جیسے کا تیسا ہی لوٹا دینا فنکاری ہے یا پھر ایک تصور Catharsis کا بھی ہے کہ اس جیون کے وش کو فن کار ہی وہ شیو ہے جو پیتا ہے، پچاتا ہے، اور جب منہ کھولتا ہے تو امرت باہر آتا ہے۔ اسی لئے غالباً ساحر نے اس شعر کو بعد میں حذف کر دیا۔ ہم سلام بن رزاق سے یہ توقع کیوں کریں کہ وہ حرکت کا عمل کا پیغام جو اقبال نے دیا تھا وہ سلام بھی دیں۔ سلام بن رزاق جیسے ہیں انہیں قبول نہ کیا جائے۔

سلام بن رزاق: ابھی زہر اور وش پر جو بات آ گئی ہے ان کی بات ادھوری رہ جائے گی اگر میں ایک واقعہ بیان نہ کروں- رام کرشنا پرم ہنس کے بعض مریدوں نے وویکانند کی شکایت کی کہ وہ ماس کھاتا ہے سگریٹ پیتا ہے مگر تم اسے سب سے زیادہ چاہتے ہو۔ رام کرشن نے بڑا پیارا جواب دیا کہ ہاں بھائی وہ زہر کھاتا ہے مگر شہد اگلتا ہے اور آپ شہد کھاتے ہیں اور زہر اگلتے ہیں۔ یہ فرق ہے آپ لوگوں کا تو ادیب میں اور ایک عام آدمی میں غالبا یہی فرق ہے۔ میں کوشش یہ کرتا ہوں کہ میں وہ فضا اور ماحول پیش کروں جس میں جبر واستحصال اور نا انصافیوں کے خلاف ایک فضا بنے اور پڑھنے والے کے ذہن میں اس کے خلاف ایک نفرت جاگ سکے۔ یہ نفرت ہی بغاوت کا پہلا قدم ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ نفرت کہیں نہ کہیں چنگاری بنے اور وہ چنگاری سلگتا شعلہ بن جائے۔ یہ میری کوشش ہے۔

مظہر محی الدین: میں یہ بات آپ کے افسانے چادر کے حوالے سے پوچھ رہا ہوں- فساد کی خبر ایک عجیب دہشت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ لیکن آپ کے افسانے میں گھر کے اندر کیرم کھیلا جا رہا ہے۔ رات کا وقت ہے فساد پھوٹ پڑا ہے۔ افسانے کا یہ رنگ کیا اس کا فطری بہاؤ ہے؟

سلام بن رزاق: دیکھئے آپنے فطری بہاؤ محسوس نہ کیا ہو لیکن میرے لئے وہ فطری بہاؤ ہے وہ سارے افراد جو غیر مسلم ہیں ان کی کوشش یہ ہے کہ یہ جو ہمارے دوست ہمارا گھر آیا ہے، مسلم ہے۔ لہذا باہر جو خوف ہے اور اس کے دل میں ہے اس کا اثر یہ قبول نہ کرے۔ اس لئے وہ کیرم کھیلنا اور بار بار اس کی خیریت پوچھنا اور چھوٹی چھوٹی باتیں کرنا یہ ساری چیزیں بظاہر غیر فطری ہیں۔ لیکن اس کے دل سے خوف کو دور کرنے کے لئے ہیں۔

فیاض قریشی: آپ نے کہا ہے کہ آپ کے کسی کردار نے آج تک خودکشی نہیں کی۔ مگر خودکشی معاشرے کی ایک حقیقت ہے۔ تو کیا آپ اس سے چشم پوشی نہیں کر رہے ہیں۔

جینا بڑے: رزاق صاحب کا یہ کہنا ہے کہ شکست خوردگی اپنی جگہ مسلم ہے لیکن وہ تمام دن مفاہمت کرنے کے بعد رات کو اپنے بستر پر جاتا ہے اور دوسرے دن پھر اٹھ کر زندگی کا سامنا کرتا ہے۔ اور جس کے یہاں زندگی کرنے کا حوصلہ باقی رہے گا وہ خود کشی نہیں کرے گا۔

منظور نعمان: آپ نے فرمایا ہے کہ رامائن اور مہابھارت کے ہیرو جیسے کردار ہمارے عہد میں نہیں ہے۔ لیکن ہم نے بچشم خود فسادات کے دوران دیکھا ہے کہ مسلم نوجوان پولیس کی گولیوں کی پرواہ کئے بغیر زخمیوں کو اٹھائے انہیں محفوظ جگہوں پر پہنچا رہے ہیں کیا ان جیسے ہیروؤں کے بارے میں آپ نہیں لکھ سکتے

جینا بڑے: ممبئی کے فساد میں ایک ایسے ہیرو دکھائی نہیں دیتے.....

سلام بن رزاق: آپ کا یہ سوال، سوال نہیں تقاضا ہے۔ پھر بھی کبھی ایسے ہیرو میرے مشاہدے میں آئے تو ان پر ضرور لکھوں گا۔

مظہر محی الدین: عزیز دوستو! اب نشست کے اختتام کا وقت ہو گیا ہے۔ گزارش کرتا ہوں چیرمین صاحب سے کہ صدارتی کلمات سے نوازیں۔

م ن سعید: مرکز محفل سلام بن رزاق صاحب، عزیز دوست جینا بڑے صاحب، اہل ذوق خواتین و حضرات سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے جس نہج پر اس نشست کا تصور باندھا تھا اس میں صدارت و دارت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ بس رزاق صاحب سے بالمشافہ گفتگو اور آپسی تبادلۂ خیال مقصود تھا کیونکہ سلام بن رزاق ہمارے عہد کے بہت ہی ممتاز اور مقبول افسانہ نگار ہیں۔ تقریباً تین گھنٹوں سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ چیرمین بننے سے پہلے بھی ایسی نشستوں کا خواب میں نے دیکھا تھا آج اس کی تعبیر بھی دیکھ لی۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ادب سے ہمارے رشتے کے ٹوٹ جانے کی جو افواہیں اڑائی گئی ہیں وہ غلط تھیں۔ اس فنکار کو آپ محض دیکھنے اور ملنے کے لئے نہیں آئے بلکہ اس کے ذہن میں جھانکنے کے لئے آئے اور یہ سلسلہ دیر سے جاری ہے۔ ہم نے شاید ایسی فضا اور ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی اور ہم خود کو اور دوسروں کو الزام دیتے تھے کہ ادب سے ہمارا رشتہ کٹ گیا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ پڑھا لکھا باذوق آدمی اپنے ادب سے رشتہ توڑ ہی نہیں سکتا۔ اس طویل گفتگو کے دوران سلام صاحب کے فن اور شخصیت، فکر اور ان کے فنی رویوں کے بارے میں ایسے بہت سے گوشے ہمارے سامنے آئے جو شاید سلام صاحب ہی بتا سکیں کہ کبھی ایسی نشست میں شرکت کا ان کو موقع پہلے بھی ملا ہے۔ ہمارے سننے والوں نے سلام صاحب سے بڑے بڑے تقاضے کر دئے ہیں۔ سلام صاحب بے حد مقبول افسانہ نگار ہیں تو ہم ان کی ذات میں خود کو شناخت کرنے لگتے ہیں اور کبھی ہم جو چاہتے ہیں کہ ہو اور وہ نہیں ہو رہا ہے تو ہمارا ہدف ایک فنکار بن جاتا ہے کہ ہم جو چاہتے ہیں وہ کیوں نہیں کر رہا ہے۔ ایسے خاصے تقاضے اقبال اور منظور نعمان اور دوسروں کی طرف سے ہوئے ہیں۔ سلام صاحب کا یہ ادبی موقف قائم ہے کہ آپ فن کار سے وہ نہیں

لکھوا سکتے جو آپ چاہتے ہیں کہ وہ لکھے۔ پھر بھی یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے قارئین کے تقاضوں سے صرف نظر کریں گے۔ ممکن ہے کہ ان کے اندر بھی کوئی تبدیلی آئے۔ شاید آئندہ تخلیقات میں ہم ان کے اثرات دیکھ بھی سکیں۔ ہم نے تو سلام صاحب سے اخذ فیض کیا ہی ہے۔ امید ہے کہ ان پر بھی کچھ نہ کچھ اثرات ضرور مرتب ہوئے ہوں گے۔

سلام بن رزاق: خلیل جبران کا ایک واقعہ سن لیجئے۔ ایک شہر میں دو عالم تھے۔ ایک خدا کا ماننے والا اور دوسرا خدا کا منکر۔ دونوں نے سوچا کہ شہر میں عالم تو ایک ہی رہ سکتا ہے، چنانچہ اس کا فیصلہ ہو جانا چاہئے۔ دن بھر دونوں کا مناظرہ جاری رہا لیکن دونوں ہی ایک دوسرے کو قائل نہ کر سکے۔ لیکن جب دونوں اپنے اپنے گھر پہنچے تو منکر خدا کا قائل ہو چکا تھا اور خدا کا ماننے والا منکر ہو گیا تھا۔ اسی طرح کچھ آپ نے مجھے مطمئن کیا اور کچھ نہیں کیا اور آپ میری بھی تمام باتوں سے متفق نہ ہوئے ہوں گے۔ لیکن کچھ نہ کچھ تبدیلی ہمارے اندر آئی ہوگی۔ تبادلۂ خیال کی یہی خوبی ہے۔

م ن سعید: واقعی ایسے تبادلہ خیال سے ذہن کی گرہیں کھل جاتی ہیں۔ میں جناب سلام بن رزاق کا اور اہلِ ذوق خواتین و حضرات کا خاص طور پر شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنی تشریف آوری سے اکاڈمی کو عزت بخش اور پُر معنی تبادلۂ خیال سے اس کا تقریب کا رتبہ بلند کیا۔ اس نشست کی نظامت کے لئے ڈاکٹر جینا بڑے کا خصوصی شکریہ کہ انہوں نے رزاق شناسی کے متعدد گوشوں کی تفہیم کو اپنے معنی خیز اشاروں سے واضح کیا اور اس لئے بھی کہ انہیں مقاماتِ آہ و فغاں سے سلامتی کے ساتھ گزر جانے کا خاص سلیقہ آتا ہے۔